اسلامی ریاست



ڈاکٹر حمید اللہ

اِسلامی ریاست

عہدِ رسالت کے

طرزِ عمل سے اِستشہاد

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
اُردو بازار لاہور

297.53 Hameedullah, Dr.Muhammad
Islami Riyasat / Dr.Muhammad Hameedullah.-
Lahore : Al-Faisal Nashran, 2004.
168p.

1. Siyasiyat I.Title Card.

ISBN 969-503-085-8

جنوری 2005ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت -/80 روپے

AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

مندرجات

عرض ناشر

یہ کتاب ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی اہم تصنیف The Muslim Conduct of State کے تکملہ کی حیثیت سے پیش کی جارہی ہے جس میں اس کے مطالب پر نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے مضامین موصوف کے بعض فی البدیہہ خطبات اور ان کے ضمن میں اٹھنے والے فکر انگیز سوالوں کے عالمانہ جوابات پر مشتمل ہیں۔ ان کا ایک ایک نقطہ ژرف نگاہی کا شاہد اور علمی استدلال کی مثال ہے۔

"اسلامی ریاست" میں مملکت کے نظم و نسق' مالیاتی نظام' قانون سازی عدالتی نظام' نظام تعلیم' تبلیغ اور بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھنے والے متعدد مسائل پر عہد رسالت کے طرز عمل سے استشہاد کیا گیا ہے اور یہی چیز اس مجموعہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے یہ ملفوظات ان کے چند عقیدت مندوں کی مساعی سے مرتب ہوئے ہیں' جنہیں ان مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ نہیں معلوم کہ جس ادارے کے زیر انتظام یہ مجالس منعقد ہوئیں' وہ خود یہ خدمت کیوں انجام نہیں دے سکا۔ بہرصورت ہم اس بیش بہا علمی خزانہ کو ضیاع سے بچانے کے لئے موجودہ صورت میں اس کی اشاعت کی جسارت کر رہے ہیں۔ کیونکہ علم' نوع انسانی کی مشترکہ میراث ہے اور اس کی طلب ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

تعارف

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یوم پیدائش 9 فروری 1908ء (مطابق 16 محرم الحرام 1326ء) ہے۔ موصوف حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے' لیکن جنوبی ہند کی اس اسلامی ریاست کے سقوط کے باعث آج کل فرانس میں پناہ گزیں ہیں' جہاں سے وقتاً" فوقتاً" توسیعی خطبات کے لئے مشرق و مغرب کے مختلف علمی مراکز میں جاتے رہتے ہیں۔

دھان پان جسم کی اس سادہ لباس و خوش مزاج شخصیت کا شمار عصر حاضر میں علوم اسلامیہ کے عظیم ترین فضلا میں ہوتا ہے اور اسلامی تاریخ و سیاست کے مختلف پہلوؤں پر ان کی تصانیف و خطبات کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کا عہد تحقیق قرن اول سے متعلق ہے اور بیشتر سیرۃ طیبہ ؐ کے گرد گھومتا ہے۔

آغاز تعلیم سے پہلی ڈاکٹریٹ کے حصول تک آپ حیدر آباد ہی میں رہے اور جامعہ عثمانیہ کے نامور طلبہ کی فہرست میں اپنے نام کا اضافہ کیا۔ پھر جرمنی کی بون یونیورسٹی اور فرانس کی سوربون یونیورسٹی سے علی الترتیب ایل ایل۔ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں لیں۔ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ جرمنی اور فرانس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد سید سلیمان ندوی اور بعض دوسرے فضلا کی معیت میں دستور پاکستان کی صورت گری کے لئے تمہیدی کام میں بھی ہاتھ بٹایا۔

موصوف تقریباً بیس سال تک فرانس کے ایک اہم علمی تحقیقاتی مرکز سے وابستہ رہے جس کے بعد نجی طور پر اسلامی تحقیق کا کام پیرس میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اردو آپ کی مادری زبان ہے اور عربی آپ کی علمی کاوشوں کا معدن۔ انگریزی' جرمن اور فرانسیسی کی تحصیل آپ نے تعلیمی ضرورتوں ہی کے لئے کرلی تھی ان کے علاوہ آپ ترکی' فارسی' اطالوی اور یونانی سے بھی واقف ہیں اور ان زبانوں میں اسلام سے متعلق ہونے والے علمی کاموں سے براہ راست استفادہ کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے خطبات تو ان مختلف زبانوں میں دیئے ہیں، لیکن تصنیف و تالیف کے لئے زیادہ انگریزی، اردو، فرانسیسی اور عربی کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ فرانسیسی میں آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے۔ عربی میں "القرآن فی کل لسان" کے عنوان سے قرآن کریم کی کتابیات مرتب کی ہے اور عہد نبوت و خلافت راشدہ کے معاہدات کی تالیف کی ہے۔ انگریزی میں اسلامی دستور پر متعدد کتابیں رقم کی ہیں جن میں سے بعض کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان دنوں آپ دوسرے کاموں کے علاوہ صحیح بخاری کا ایک جامع اشاریہ ترتیب دے رہے ہیں۔

باب 1

مملکت اور نظم و نسق

قرآن مجید کے مطابق' مذہب اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے جسے اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔" ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ..... "یعنی اسلام دین و دنیا دونوں جہانوں کی بھلائی چاہتا ہے' دونوں عالم میں کوشش کرنے کی اجازت دیتا ہے اور دونوں جہانوں میں نیک بننے کا راستہ بتاتا ہے۔ دین اسلام میں جہاں ایک طرف نماز' روزہ اور حج جیسی روحانی چیزوں کا ذکر ہے' وہاں زکوۃ کا ذکر بھی ہے جو ایک مالی مسئلہ ہے لیکن اسے رکن ایمان اور رکن دین بنایا گیا ہے۔ آج میرے پیش نظر صرف یہ بتانا ہے کہ کن حالات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ ایک حکومت قائم فرمائیں۔ حکومت کی اقامت پر مجبور ہونے کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ نبی دنیا اور دنیوی اقتدار کا طالب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک مملکت قائم کرتے ہیں اور اس مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکمرانی بھی فرماتے ہیں۔ یہ کن حالات میں ہوا اور کس طرح یہ مشکل کام انجام پایا؟ اور پھر اس مملکت میں جس کا وجود ہی نہ تھا' ہر چیز کا نظم و نسق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ اور ایسا نظم و نسق چھوڑا کہ وہ آپؐ کے بعد صدیوں تک چلتا رہا اور نبی اکرم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام جہاں بانی سے فائدہ اٹھاتے آ رہے ہیں۔ بہر حال قبل اس کے کہ اسلامی مملکت کے متعلق کچھ عرض کروں' غالباً بے محل نہ ہوگا کہ جزیرہ نمائے عرب میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مملکت کی کیا صورت حال پائی جاتی تھی' اس کی طرف کچھ مختصراً اشارہ کروں۔

ظہور قدسی سے قبل:- یہ حیرت انگیز بات ہے کہ شہر روما میں نہیں' بلکہ ایتھنز کی شہری

ریاست کے وجود میں آنے سے بھی پہلے جنوبی عرب خصوصاً یمن میں ایک مملکت پائی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں عرب کا تمدن یورپ کے قدیم تمدنوں سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ جو مملکتیں یمن میں قائم کی گئی تھیں' ان کا نظم و نسق اچھا خاصا ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔ یمن کے آثار قدیمہ سے اور وہاں کے کتبوں سے یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کو امور حکمرانی اور رعایا کے فلاح و بہبود کے انتظامات سے بہت دلچسپی رہی اور وہاں ایسے کارنامے وجود میں آئے کہ آج ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹے سے صحرائی ملک میں یہ کام کیسے انجام پائے؟ مثال کے طور پر قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا شخص جانتا ہے کہ وہاں ایک مرتبہ "سیل العرم" کا سانحہ رونما ہوا تھا۔ ایک مقام پر دریا میں بند باندھ کر ایک بہت بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ بند ٹوٹ جانے سے زبردست سیلاب آیا اور بہت نقصان ہوا تھا۔ وہاں کی رعایا کو ترک وطن کرکے دیگر علاقوں میں بسنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ وہ تالاب جو آج بھی یمن میں موجود ہے' اپنی اس شکستہ حالت میں بھی اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی مرمت کے لئے کئی ارب روپے درکار ہیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب قدیم یونان کا مشہور شہر ایتھنز ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ یمن میں بلقیس کی حکمرانی تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہم عصر تھی۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک مختلف حکمران وہاں حکومت کرتے رہے اور وہاں کی فطری زرخیزی اور مختلف قیمتی پیداوار کی وجہ سے اس ملک پر ایشیاء یورپ اور افریقہ' غرضیکہ ہر طرف سے حملے بھی ہوتے رہے۔ چنانچہ یونانیوں نے بھی یمن پر حملہ کیا اور ان کے یونانی کتبے بھی آج تک ہمیں یمن میں بعض مقامات پر ملتے ہیں۔ عہد نبویؐ سے پہلے حبشہ کے بادشاہ نے وہاں کے حکمرانوں کو شکست دے کر یمن پر قبضہ کرلیا۔ کہتے ہیں کہ وہاں جو عیسائی بادشاہ تھا' اس نے اپنے پایہ تخت صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا بھی بنالیا تھا۔ اسے جلن یہ ہوئی کہ لوگ صحرا کے بے آب و گیاہ شہر مکہ میں حج کے لئے کیوں جاتے ہیں؟ چنانچہ اس بادشاہ نے ایک فوج تیار کرائی اور کعبہ کو ڈھانے کے عزم سے مکہ کی طرف روانہ ہوا' قرآن مجید کی "سورہ فیل" میں اسی کا ذکر ہے۔ ہمارے مؤرخ لکھتے ہیں کہ جس سال اصحاب فیل کا مکہ پر حملہ ہوا اسی سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ یمن کے مقامی لوگوں کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ یمن میں حبشیوں کی حکومت تھی چنانچہ مقامی یمنی باشندوں نے حبشیوں کے تسلط سے آزاد ہونے کے لئے ایک قومی تحریک شروع کی اور اس

مقصد کی تکمیل کے لئے یمن کے سردار ایران گئے' اور ایران کے بادشاہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس روایت کے دلچسپ الفاظ یہ ہیں کہ ایک سردار نے کسریٰ سے کہا کہ ہمارے ملک پر کوؤں نے قبضہ کرلیا ہے آپ ہمیں مدد دیجئے۔ اس نے پوچھا کون سے کوے؟ ہندوستان کے کوے یا افریقہ کے؟ کسریٰ نے خیال کیا کہ عرصے سے مجھے تمنا تھی کہ میں یمن پر قبضہ کروں' اب یہ موقعہ ہاتھ آیا ہے' اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ لہٰذا اس نے فوج سے مدد کی' جنگ میں حبشیوں کو شکست دی اور اس علاقے پر ایرانیوں کے ماتحت مقامی سردار کی سربراہی میں یمنی حکومت قائم ہوئی۔ اس زمانے میں مکہ سے عبدالمطلب یمن جاتے ہیں اور اس حکمران کو اپنی طرف سے اور اپنے ملک کی طرف سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل ہمیں ملتی ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یمن اور مکہ کے تعلقات بہت قریبی تھے۔

یمن میں یمنی حکمران برائے نام حاکم تھا۔ جلد ہی ایرانیوں نے اپنے قبضے اور اپنی فوج کی موجودگی سے بے جا فائدہ اٹھا کر اسے بے دخل کردیا اور خود ہی وہاں حکومت کرنے لگے۔ عہد نبوی صلعم کے دور آخر میں جب یمن میں اسلام کی اشاعت ہوئی تو اس زمانے میں ایران میں ایرانی حکومت ضعف و انحطاط کا شکار ہوچکی تھی اور رومی سلطنت سے جنگ میں شکست کھانے کے بعد اس کی فوجی طاقت کمزور ہوگئی تھی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یمنیوں نے ایران کے خلاف بغاوت کی اس وقت یمن کا جو ایرانی گورنر تھا' اس نے اسلام قبول کرلیا۔ اس طرح اس نے اپنے آپ کو اور اپنے ہم نسل ایرانی ساتھیوں کو' جو یمن میں تھے' بچانے کی کوشش کی جس سے یمن میں ایک انٹرنیشنل پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ اس پہلو پر بحث کا موقع نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عرب میں قدیم ترین حکومتیں ہمیں یمن میں نظر آتی ہیں اور صرف وہیں نہیں اور مقامات پر بھی حکومتوں کا پتہ چلتا ہے۔

مکہ کا نظم و نسق:۔ یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی ہم اولاً یہ معلوم کریں گے کہ وہاں کوئی حکومت تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو کس قسم کی حکومت تھی؟ مکہ کے متعلق آپ سب اچھی طرح واقف ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر کی بنا ڈالی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ نے حکم دیا کہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ماں حضرت ہاجرہ کو فلسطین سے لاکر اس بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ دیں تو وہاں کوئی آبادی نہیں تھی حضرت

ابراہیم علیہ السلام واپس چلے جاتے ہیں ان کے جانے کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پیاس محسوس ہوتی ہے۔ جہاں وہ پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے' وہاں زمزم کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ اتفاق سے ایک قافلہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ پانی کے آثار دیکھ کر قافلے والے وہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ پھر وہاں پانی کی کثرت کی خبر سن کر اور لوگ بھی آکر بسنے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھنے لگتی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی شادی مقامی قبیلے کے ایک گھرانے میں ہوتی ہے اور اس قبیلے کی آبادی مکے میں پھیلتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اب ایک اہم واقعہ' یعنی کعبے کی از سرنو تعمیر کا ذکر کرنا ہے۔ اسلامی روایت کے مطابق جب حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں آئے اور جنت کی جگہ زمین پر رہنے لگے تو یہاں ان کو ایک طرح کی کمی محسوس ہوئی۔ وہ جنت میں دیکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی عبادت کے لئے بیت المعمور کے اطراف طواف کرتے ہیں۔ زمین پر کوئی عبادت گاہ موجود نہیں تھی۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے عبادت گاہ کی نعمت سے محروم نہ رکھا جائے۔ چنانچہ اللہ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی مدد کے لئے مامور کیا کہ زمین پر بھی بیت المعمور کی طرح سے عبادت گاہ تعمیر کی۔ حدیث میں علامتی طور پر (Symbolically) یہ الفاظ ہیں کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر پھینکا جائے تو سیدھے کعبے کی چھت پر گرے گا۔ یہ کعبہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بنایا گیا وہ زمین پر حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے زمانے تک قائم رہا۔ طوفان کے بعد اس کے کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں اس کی تعمیر جدید کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان کے بعد جو بڑے پیغمبر آئے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ کعبہ کی از سرنو تعمیر کریں۔ انہوں نے کہا کہ آمنا و صدقنا سر آنکھوں پر' لیکن مجھے معلوم نہیں کہ پہلا کعبہ کس مقام پر واقع تھا؟ اللہ نے کہا یہ دیکھو' تمہارے سامنے بادل کا جو ٹکڑا اس وقت حرکت کرتا ہے' تم اس کے سائے پر چلو اور جس مقام پر یہ سایہ رک جائے گا وہی مقام ہے جہاں کعبہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سائے کے نیچے چلتے گئے۔ وہ اس مقام پر پہنچے جہاں اب کعبہ ہے اور یہاں بادل نے حرکت ختم کر دی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پتھر لگا کر یا کسی اور طرح سے نشانیاں بنائیں جو اس سائے کے طول و عرض پر مشتمل تھیں اور یہ تھا کعبہ کا خاکہ انہوں نے وہاں تھوڑی سی کھدائی کی تو دیکھا کہ پرانی بنیاد کے آثار وہاں موجود ہیں۔ اس بنیاد پر انہوں نے نئی عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔ اس

وقت ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام بھی بڑے ہو چکے تھے' چنانچہ اپنے بیٹے کی مدد سے انہوں نے وہاں چار دیواروں سے گھیر کر ایک بہت ہی سادہ قسم کی عمارت بنائی' جب وہ دیواریں قد سے بھی اونچی ہونے لگیں تو اس وقت انہیں ضرورت پیش آئی کہ دیواروں کو مزید بلند کرنے کے لئے کوئی سہارا لیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر کرنے لگے۔ یہ پتھر "مقام ابراہیم" کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ ایک زمانے میں وہ کعبہ کے عین سامنے دیوار کے پاس تھا' جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام عمارت بناتے تھے۔ اسلامی مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ طغیانی آئی تو یہ پتھر بہہ گیا اور بہت مشکل سے دستیاب ہوا' اب اس کو پرانے مقام پر رکھنے کی بجائے کعبہ کے اندر رکھ دیا گیا' پھر کچھ زمانے کے بعد اس کو نکالا گیا اور ایک دوسرے مقام پر رکھ دیا گیا اور اب تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ کعبہ کے سامنے اس کو ایک صندوق کے اندر بند کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عبادت گاہ تعمیر کی اور اس کو خدائے واحد کا بیت اللہ قرار دیا۔ بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے' اس میں لکھا ہے کہ جب وہ عراق سے ترک وطن کر کے فلسطین آئے تو انہوں نے مختلف مقامات پر "بیت ایل" تعمیر کئے۔ "بیت" وہی لفظ ہے جو عربی میں ہے اور "ایل" کے معنی اللہ کے ہیں۔ یہ لفظ ہم کو "جبرائیل" اور "اسرائیل" وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ "بیت ایل" کے معنی ہیں۔ "اللہ کا گھر" بائبل کے مطابق انہوں نے فلسطین کے بہت سے مقاموں پر اللہ کی عبادت گاہیں تعمیر کیں اور مقامی باشندوں کو بتایا کہ اپنے پروردگار اور خالق کی کس طرح عبادت کریں۔

بیت اللہ:۔ یہ مقام حیرت نہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ عرب میں آئے تو مکہ میں اس بچے اور اس کی اولاد کے لئے اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے بھی انہوں نے ایک "بیت ایل" یا بیت اللہ تعمیر کیا جو اب تک چلا آتا ہے۔ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ کعبہ دنیا میں وہ قدیم ترین عبادت گاہ ہے جو اللہ کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔ اگر ہم یہ بیان ان معنوں میں لیں کہ وہ قدیم ترین گھر جو اب تک موجود ہے تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یہ کہیں کہ سب سے پہلے جو گھر تعمیر کیا گیا وہ کعبہ ہے تو اس لحاظ سے اعتراض ہوگا کہ آخر اور بھی تو پیغمبر دنیا میں آچکے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام وغیرہ ہوئے ہیں ان کے زمانے میں بھی اللہ کی عبادت و اطاعت ہوتی تھی' اور ان کے ہاں بھی

کوئی عبادت گاہ ہوگی جو کعبہ سے پہلے ہوگی تو اگر ہم کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مختص نہ کریں اور اس سے پہلے کے پیغمبروں یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی بنائی ہوئی عبادت گاہ قرار دادیں تو پھر قرآن کے بیان میں کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو مکان بنایا' اس پر عیسائیوں کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے اور بھی مقامات پر "بیت ایل" بنائے تھے۔ جب اور بھی گھر بنائے تھے تو حجاز میں بنانے پر کیوں اعتراض کیا جائے؟ بہرحال بیت اللہ کا حج جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے معین کیا تھا' اس کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا اور اس کے نگران پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور ان کے بعد ان کی اولاد اس کی متولی رہی۔ بعد میں جنگیں ہوئیں اور لوگ مکہ پر آکر قابض ہوتے رہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جس کو میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا' کہنا یہ ہے کہ جس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اس وقت مکہ کی چند خصوصیتیں ہمیں حیرت انگیز نظر آتی ہیں' وہ یہ کہ مکہ نہ صرف بہت مالدار اور تجارتی شہر تھا بلکہ ساتھ ساتھ اس کے نظم و نسق کے لئے ایک حکومت بھی پائی جاتی تھی۔ جس میں بارہ وزیر ہوا کرتے تھے' یہ چیزیں ایسی ہیں جن پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ میں اس کا حال مختصر طور پر آپ سے بیان کروں گا۔ جہاں تک تجارت کا تعلق ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے' نسل ہا نسل کے انتظامات کا نتیجہ تھی۔ قرآن مجید کی "سورۃ القریش" سے آپ واقف ہیں جس میں مکے والوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے تمہیں سردی اور گرمی کے سفر کے ذریعہ مال بھی دیا اور خوف سے بھی تم کو بچالیا' لہٰذا اس اللہ کا تمہیں شکر گزار ہونا چاہیئے۔

جغرافیائی اہمیت:۔ جغرافیائی نقطہ نگاہ سے مکہ ایک اہم مقام تھا کہ عرب کے شمال اور جنوب کے لوگ جب تجارت کے لئے جاتے تھے تو انہیں مکہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی تجارت ہندوستان سے مکہ کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مکہ کی جغرافیائی اہمیت کیا تھی۔ اس زمانے میں تجارتی قافلوں اور کاروانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ غذا' پانی اور ٹھہرنے کی جگہ کا بندوبست کریں۔ مکہ میں جو زمزم کا چشمہ یا کنواں تھا وہ ایسی چیز تھی کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا تمام قافلے وہاں سے گزرا کرتے تھے۔ مکہ کی اس تجارتی حیثیت کو اور بھی مستحکم کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد نے ایک مرتبہ اپنے

بیٹوں میں سے ایک کو قیصر کے پاس بھیجا' دوسرے کو کسریٰ کے پاس بھیجا' تیسرے کو نجاشی کے پاس اور چوتھے کو یمن کے حکمرانوں کے پاس بھیجا اور ان سے معاہدہ یہ کیا کہ ہمیں اس بات کی اجازت ہو کہ ہم تجارتی قافلے تمہارے ملک میں لائیں۔ اپنا مال وہاں فروخت کریں اور تمہارے ملک کی پیداوار ہم خرید کر اپنے ملک کو لے جائیں۔ اس تجارتی معاہدے کو ان حکمرانوں نے بھی پسند کیا اور قبول کر لیا۔

مکے والوں نے یہ سوچا کہ ممکن ہے لٹیرے بدوؤں کے قبیلے تجارتی قافلوں کو اپنے علاقوں سے گزرتے دیکھ کر چھاپہ ماریں اور انہیں لوٹ لیں' اس لئے مکے کی زیارت گاہ اور مال تجارت کی حفاظت کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا جائے۔ چنانچہ مکے کے افسروں نے ان تمام قبائل کے سرداروں سے' جو کاروان تجارت کے راستوں پر پڑتے تھے گفتگو کی اور ان سے کہا کہ ان تجارتی قافلوں سے ہمیں جو منفعت ہوگی اس میں سے کچھ حصہ تمہیں بھی دیا جائے گا۔ اس لالچ میں انہوں نے قبول کیا کہ ہم تمہارے کاروانوں پر حملہ نہیں کریں گے' لیکن ہمیں آزادی رہے گی کہ دوسرے کاروانوں کو لوٹیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مکی سرداروں نے کہا کہ اگر تمہارے پاس کچھ فروخت کرنے کا سامان ہو' مثلاً بھیڑ بکریوں کے چمڑے یا زیتون کا تیل وغیرہ تو وہ ہمیں دے دو' ہم اسے فروخت کریں گے اور پورا منافع بغیر کسی معاوضے کے تمہیں پہنچا دیا کریں گے۔ غرض کہ ان قبائلی سرداروں سے معاشی معاہدوں اور ہر طرف سے حفاظتی انتظامات کے باعث مکہ معظمہ عرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور انتہائی مال دار شہر بن گیا تھا۔ اس کی دولت مندی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مدینے کے ابتدائی زمانے میں ایک اسلامی دستے نے مشرکین مکہ کے ایک کاروان پر چھاپہ مارا تھا اور اس میں جو مال غنیمت ملا' اس کی مالیت ایک لاکھ درہم تھی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ درہم کی قیمت آج کل کے کروڑوں روپے کے برابر تھی' یہ ایک کاروان کا سرمایہ تھا۔ اس سے ہم قریش کی دولت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ معاشی نقطہ نظر سے مختلف ملکوں کے تجارتی قافلوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے قریش نے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ ان کا کوئی آدمی بطور محافظ قافلے کے ساتھ سفر کیا کرتا تھا۔

سیاسی ادارے:۔ جہاں تک سیاسی نظم و نسق کا تعلق ہے' شہر مکہ ایک شہری مملکت تھی جس کا رقبہ (حدود حرم کی اساس پر) تقریباً ایک سو تیس مربع میل تھا۔ وہاں بادشاہت کی جگہ ایک طرح

کی سیلف گورنمنٹ تھی یعنی ایک مجلس وزراء اس کے انتظام کی ذمہ دار تھی۔ اس کی تفصیلیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ نہایت ہی مختصراً ذکر کروں گا کہ اس میں دیوانی مقدمات اور فوجداری مقدمات کے لئے الگ الگ وزیر تھے' کعبہ کے انتظام کے لئے' یعنی دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے لئے ایک وزیر تھا' اس طرح وہاں غیب دانی کے لئے یعنی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کوئی کام ہمیں کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے' ان کے پاس تیر ہوا کرتے تھے جن سے وہ فال نکالا کرتے تھے۔ ان تیروں کی نگرانی کرنے والا ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح کعبے میں باہر سے آنے والے زائرین چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے' ان چڑھاوؤں کی حفاظت کے لئے ایک اور وزیر مقرر تھا۔ اسی طرح ٹیکسیشن کے لئے بھی ایک وزیر تھا۔ یعنی شہر مکہ کے باشندے ہر سال اپنے افسر متعلقہ کو کچھ رقم بطور ٹیکس دیتے تھے جس کا اولاً مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ اگر کوئی حاجی کسی نہ کسی وجہ سے مکہ میں اپنے آپ کو بے بس پائے یا اس کے پاس پیسے بالکل نہ رہیں یا اس کی سواری کا اونٹ مرجائے تو ایسے مجبور لوگوں کی مدد کے لئے اور حج کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کی ضیافت اور مہمانداری پر خرچ کرنے کی غرض سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جس کا انتظام' ظاہر ہے کہ ایک خصوصی وزیر کے سپرد ہوتا تھا۔

ایک اور ادارہ تھا جس کو دارالندوہ کہنا چاہئے۔ جب کبھی کوئی مشکل مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ مثلاً کسی دشمن کے حملے کا خطرہ یا کوئی اور معاملہ درپیش ہوتا تو سارے باشندوں کی جگہ ان کے نمائندوں سے گفتگو ہوتی تھی۔ لکھا ہے کہ ہر وہ شخص جس کی عمر چالیس سال ہو جاتی وہ خود بخود اس مجلس مشاورت یا اس پارلیمینٹ کا رکن بن جاتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دو آدمیوں کو اس سے مستثنیٰ کردیا گیا تھا یعنی ان کو چالیس سال کی عمر کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا رکن بنالیا گیا تھا۔ ان میں ایک ہمارے "دوست" ابوجہل صاحب بھی تھے۔ ان کی فراست اور عقل مندی کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ ان کو نوجوانی میں ہی اس کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور شخص کا بھی ذکر آتا ہے۔ سب سے عجیب و غریب جو بات ہمیں نظر آتی ہے' وہ وزارت خارجہ کا عہدہ ہے۔ وزارت خارجہ کا دائرہ کار یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی کسی بیرونی قبیلے سے گفتگو کی ضرورت پیش آتی' کسی جھگڑے کا تصفیہ اور مصالحت کرانی ہوتی یا دشمن کے مطالبات کو نہ ماننے کی صورت میں اعلان جنگ کرنا پڑتا تو ایسے تمام خارجہ معاملات کے انتظام و انصرام کے لئے بھی ایک عہدہ دار پایا جاتا تھا۔ یہ تمام وزراء

عہد نبوی صلعم تک پائے جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر نام بہت مشہور و معروف ہیں مثلاً دیوانی مقدمات حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھے' وزارت خارجہ کا منصب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھا' اس طرح فوج کا جھنڈا حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے سپرد تھا۔ یہ تمام نام تاریخ اسلامی میں آتے ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے کی مشہور شخصیتیں تھیں اور مکے کی حکومت میں ان کو خاصا مقام حاصل تھا۔ دوسرے لفظوں میں شہر مکہ میں ایک مملکت پائی جاتی تھی اور یہ مملکت ایک شہری مملکت تھی' اس کا انتظام بجائے ایک فرد کے ہاتھ میں ہونے کے ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ ہے مختصر خلاصہ اس سیاسی نظام کا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت شہر مکہ میں پایا جاتا تھا۔

بعثت سے قبل:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوتی ہے۔ ابتدائی چالیس سال تک وہ اس شہر کے شہری باشندے رہے۔ کوئی ایسی بات ہمیں نظر نہیں آئی جو قابل ذکر ہو' بجز اس کے کہ اور قبیلوں کی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان بنی ہاشم بھی اس نظام حکومت میں شامل تھا' یعنی ایک وزارت اس خاندان کے بھی سپرد تھی' وہ وزارت زمزم کے کنویں کے انتظام کے متعلق تھی۔ اس میں منفعت بھی زیادہ تھی۔ اگرچہ ہمیں صراحت سے معلوم نہیں ہوتا لیکن اور مقاموں' مثلاً شام وغیرہ میں اس کا پتا چلتا ہے کہ عبادت گاہ کے کنویں کا پانی حاجیوں کو دیا جائے تو انعام یا ٹیکس کے طور پر اس پانی دینے والے کو لوگ اپنی طرف سے رقم دیا کرتے تھے۔ اگر مکے میں بھی ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس سے کافی منفعت ہوتی ہوگی۔ یہ کنواں چونکہ بڑی مدت کے بعد عبدالمطلب نے دریافت کیا تھا' اس لئے انہی کی نگرانی میں رہا اور غالباً ان کی خاطر شہری مملکت کے نام میں ایک نئی وزارت کا اضافہ کردیا گیا۔ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد یہ انتظام ان کے بیٹے ابو طالب نے سنبھالا۔ ابوطالب بہت فراخ دل تھے لیکن ان کی مالی حالت خراب تھی اور اکثر قرض لینے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے بھائی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کچھ رقم قرض لی اور کہا کہ ایک سال بعد ادا کردوں گا۔ ایک سال بعد آپ رقم ادا نہ کرسکے تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اگر تم مزید مہلت چاہتے ہو تو میں اس شرط پر آمادہ ہوں کہ زمزم کی نگرانی مجھے دے دی جائے۔ اس طرح چاہ زمزم حضرت ابوطالب کی جگہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبضے میں آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توثیق

بھی کی۔ غرض یہ کہ بنی ہاشم کو بھی مکہ شہر کے انتظام میں دستوری طور سے ایک مقام حاصل تھا۔ بعد کے زمانے میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نظم و نسق میں کیا حصہ لیا اور مکہ شہر میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ شہر مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوتے رہے ان کی تعداد بہت ہی آہستہ آہستہ بڑھی' لیکن وہ تھے سارے ہی قبیلوں کے' اور انہوں نے مملکت کے اندر ایک مملکت بنالی۔ وہ مکہ شہر میں رہتے تھے' لیکن اگر انہیں عدالتی مسئلے کی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ ان افسروں کے پاس نہیں جاتے تھے جن کے پاس عدل گری کا کام تھا۔ اگر انہیں فوجی دفاع کے سلسلے میں ضرورت پیش آتی تو ان کو مکہ والوں سے امداد کی توقع نہ تھی۔ غرض وہ ہر کام میں رسول اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مکہ کے اکثر مسلمان بھی ہجرت کر کے مدینے میں جابسے۔

مدینے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مہاجرین کے معاشی مسائل حل کرنے کے لئے مواخات کا انتظام کیا۔ اس کے بعد جو کام ہوا' اس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے یعنی مملکت کا قیام۔ مدینے میں کسی شہری مملکت کا وجود نہیں تھا۔ " یہاں پر اسلام سے پہلے کئی قبیلے آباد تھے اور ان قبیلوں میں بھی آپس میں خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ آخری جنگ ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی جس میں بہت ہی شدید خون ریزی ہوئی اور اس کے اثرات خود اسلامی معاشرے پر بھی پڑے۔ اشارۃ" میں دو چیزوں کا ذکر کرتا ہوں۔ لکھا ہے کہ ہجرت سے پہلے جب مدینے کے کچھ لوگ "اوس" قبیلے میں سے اور کچھ لوگ "خزرج" قبیلے کے بھی مسلمان ہوئے تو چونکہ ان دونوں قبیلوں میں جھگڑا تھا اگر امام "خزرجی" ہوتا تو "اوسی" مسلمان اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ مکے سے ایک امام بھیجا جائے تاکہ اس کے پیچھے "اوسی" اور "خزرجی" دونوں نماز پڑھ سکیں۔ ایک اور واقعہ جس کو ہم اس سے بھی زیادہ افسوس ناک کہہ سکتے ہیں یہ نظر آتا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں میں سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بہت ہی اچھے راسخ العقیدہ اور اسلام کے لئے سرگرم کار مسلمان تھے۔ وہ "خزرج" قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے قبا پہنچے تو ایسے بہت سے لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے دیکھ چکے تھے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے' آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں' سلام عرض کرتے ہیں اور مہمان نوازی کے فرائض انجام

دیتے ہیں، لیکن ان میں سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نظر نہیں آتے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پوچھا کہ سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ کہاں ہیں تو قبا کے باشندے "اوسیوں" نے شرمندگی کے انداز میں کہا کہ گزشتہ جنگ بعاث میں انہوں نے ہمارے بعض سرداروں کو قتل کیا تھا۔ اس لئے انہیں جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمارے علاقے میں آئیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں حکومت کرنے کے لئے کن دشواریوں کا سامنا تھا۔ بہرحال اسی رات کا کافی حصہ گزرنے پر ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے بھیس بدلے ہوئے، چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے آتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچتا ہے تو نقاب اٹھاتا ہے۔ یہ تھے سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیرت سے پوچھتے ہیں کہ تم کیسے آئے؟ انہوں نے کہا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائیں اور میں نہ آؤں، یہ ناممکن تھا۔ جان پر کھیل کر حاضر ہوا ہوں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوشش کرتے ہیں کہ قبیلہ "اوس" ان کو باقاعدہ طور پر پناہ دینے کا اعلان کرے تاکہ اگر وہ آئیں تو کھلم کھلا آسکیں اور انہیں کوئی "اوسی" شخص نہ ستائے۔ مگر وہ ہچکچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ حکم دیں گے تو ہم تعمیل کریں گے لیکن ہم خود پناہ دینا نہیں چاہتے" ایک "اوسی" سردار نے اس کو قبول کیا۔ چنانچہ وہ سعد ابن معاذ کے مکان پر گئے ان کو ساتھ لے کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے ہیں اور "اوسی" قبیلے کے لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کے سردار نے سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پناہ دی ہے۔ پھر اس کے بعد سے امن قائم ہوتا ہے تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدینے میں حکومت کرنا کتنا مشکل کام تھا اور کن تدبیروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ آہستہ ان مشکلوں کو دور کیا۔

دستور مملکت:۔ اس ابتدائی کام سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تجویز پیش کی کہ مدینہ میں ایک چھوٹی سی مملکت قائم کی جائے۔ لیکن ابتدا ہی میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ بعاث کے بعد مدینے والوں نے یہ سوچا تھا کہ آئے دن کی جنگ ہم سب کے لئے نقصان کا باعث ہے، اس کو ختم کرنا چاہئے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح ختم کریں؟ اگر کوئی بادشاہ بنایا جائے تو وہ کس قبیلے کا ہو جس کی اطاعت "خزرجیوں" اور "اوسیوں"

میں سبھی کو قبول ہو۔ خزرجی قبیلے کا ایک سردار' عبداللہ بن ابی بن سلول بہت مالدار اور صاحب اقتدار تھا۔ خزرجیوں کو توقع تھی کہ "اوسی" بھی اس کی مخالفت نہ کریں گے' چنانچہ اس کے لئے تاج شہریاری تیار ہونے لگا۔ اس اثناء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ "اوسی" اور "خزرجی" مسلمانوں کو اب عبداللہ بن ابی بن سلول سے کوئی دلچسپی نہ رہی اس کا نتیجہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت پیدا ہو گئی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غاصب ہیں' میرے اقتدار اور میری بادشاہت میں خارج ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ شخص ساری عمر منافق رہا اور آئے دن اسلام کے لئے دشواریاں پیدا کرتا رہا۔ "واقعہ افک" میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو الزام لگایا گیا وہ بھی انہی صاحب کی کارگزاری تھی۔ جنگ تبوک کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی ایک سازش ہوئی تھی' اس میں بھی اس کا دخل تھا۔ بہرحال ایک طرف عبداللہ بن ابی کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی نظم و نسق میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ علاوہ ازیں "اوس" قبیلے کے ایک عیسائی' ابو عامر راہب نے دوسرا فتنہ کھڑا کیا۔ اس کو بائبل کے مطالعے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا امکان ہے' چنانچہ اس نے سوچا کہ خود نبوت کا دعویٰ کرے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو وہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑتا ہے' کہتا ہے کہ تم جھوٹے نبی ہو (نعوذ باللہ) نبی موعود تو میں ہوں۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو شروع ہی سے بہت سی دشواریاں پیش آتی رہیں۔

اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا کی بجائے اس مقام پر رہنا پسند کیا جو "اوسیوں" کے نہیں "خزرجیوں" کے علاقے میں تھا۔ اس کی وجہ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بیان کی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے۔ عبدالمطلبؓ کی ماں قبیلہ خزرج سے تھیں۔ چنانچہ قبا سے نکل کر اس مقام پر قیام کیا جہاں بنو نجار کا قبیلہ رہتا تھا اور جلد ہی وہاں ایک جلسہ طلب کیا گیا۔ شہر مدینہ کی آبادی کے جو مختلف عناصر تھے' ان سب کے نمائندوں کو بلایا اور ان کے سامنے حکومت قائم کرنے کی پیش کی۔ اس تجویز کو اکثریت نے قبول کیا۔ لکھا ہے کہ صرف دو یا چار "اوسی" اشخاص نے انکار کیا۔ اس طرح ایک مملکت قائم ہوتی ہے جو ایک شہر بھی نہیں بلکہ ایک شہر کے کچھ حصے پر مشتمل ہونے کے باوجود' علمی اور تاریخی نقطہ نظر سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی

ہے۔ وہ یوں کہ ایک مملکت میں حکمران اور رعایا کے جو حقوق و فرائض ہوں گے' ان کو تحریری طور سے مرتب کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں اس مملکت کے دستور مرتب کر کے سب کے سامنے پیش کیا گیا اور سب کے مشورے سے اسے لکھا گیا۔ اس تاریخی دستاویز کی خاص قابل ذکر اہمیت یہ ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور "امی" شخص کے ہاتھوں وجود میں آتا ہے۔

اس دستور کی ساری دفعات کی تشریح شروع کردوں تو اس کے لئے کم از کم مجھے ایک پورا دن درکار ہوگا۔ مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ اس طرف تو یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مملکت ایک مستقل اور خود مختار مملکت ہوگی اور یہ بھی صراحت ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہوگی۔ چنانچہ ایک دفعہ کے الفاظ یہ ہیں کہ " للمسلمین دینہم و للیہود دینہم" یعنی مسلمانوں کے لئے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے یعنی وہاں جتنے بھی لوگ بستے تھے ان کو دینی آزادی کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ اس طرح دفاع کے سلسلے میں جو انتظام کیا گیا وہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اس پہلو پر کچھ عرض کرنے سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حکومت کا صدر تسلیم کیا گیا۔ غالباً خالص دنیوی نقطہ نگاہ سے ہم اس پر غور کریں تو وجہ یہ نظر آتی ہے کہ "اوسیوں" کا کوئی بادشاہ مقرر کیا جاتا تو "خزرجی" اس کو قبول نہ کرتے اور اگر "خزرجیوں" میں منتخب کرتے تو "اوسی" اس کو قبول نہ کرتے۔ چنانچہ سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ آپس میں لڑنے والے قبائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد رکھتے اور آپ کو نبی مانتے تھے۔ آپ کی غیر جانبداری' آپ کی عدل گستری' آپ کا تحمل و تدبر اور آپ کی فیاضی کا چند مہینوں کے عرصے میں سب لوگوں کو تجربہ ہو چکا تھا۔

دفاع:۔ دفاع کے سلسلے میں' اس دستور میں جو صراحتیں ہیں' ان میں سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ امن اور جنگ ناقابل تقسیم چیز ہوگی' یعنی اگر امن ہو تو اس سلطنت کے سارے باشندوں کے لئے ہوگا اور جنگ ہو تو سارے باشندوں کے لئے' صلح و جنگ کی مرکزیت اور ناقابل تقسیم ہونا ایک اہم بات تھی' پھر اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ اگر جنگ کے لئے باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہوگا کہ کون فوج میں شریک رہے اور کون فریق فوج میں نہ رہے۔ گویا آپ' کو کمانڈر انچیف سے بھی زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ آپ کو اختیار تھا کہ اپنی فوج سے ان تمام لوگوں کو خارج کردیں جو مشتبہ ہوں اور جو

فوج کے اندر رہ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہیں۔ گویا آپ نہ صرف جنگی انتظامات کے مالک تھے بلکہ جنگ کے سیاسی پہلوؤں پر بھی آپؐ ہی کا دخل تسلیم کیا گیا۔ البتہ یہ صراحت ہے کہ اگر باہر سے کوئی دشمن حملہ آور ہو تو ہر حملہ براہ راست مدافعت کرے گا اور لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور یہ بھی کہ فوج میں جو اخراجات ہوں وہ ہر محلہ یعنی ہر قبیلہ خود برداشت کرے گا۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کے پاس کوئی سرکاری خزانہ نہیں تھا۔ لہٰذا مجبوراً یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ لوگ رضا کارانہ اور بلا تنخواہ فوج میں داخل ہوں۔ لیکن فوج کی باگ دوڑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور فوجی انتظامات خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے ہیں۔ اسی طرح دستور میں عدل گستری کا بھی ذکر ہے کہ ابتدائی عدالت تو قبیلہ وار ہوگی۔ یعنی قبیلے کے دو افراد میں جھگڑا ہو تو لوگ اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کریں گے۔ لیکن اگر فریقین دو مختلف قبیلوں کے ہوں تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا پڑے گا۔ اگرچہ انہیں اختیار تھا کہ کسی اور شخص کو بھی اپنا حاکم بنالیں لیکن آخری حاکم عدالت بالفاظ دیگر عدالت اپیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے' دیگر تفصیلیں جو اس دستور میں آئی ہیں ان کے سلسلے میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ حکمرانوں کو کیا اختیارات حاصل ہیں۔ اس دستور میں ایک چیز جو غیر معمولی اور غیر متوقع کہی جاسکتی ہے' وہ بیمے کا انتظام ہے۔ اس کی تفصیل پہلے کسی جگہ آچکی ہے۔ یہاں اشارۃً ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر فدیہ یا خون بہا کی گراں قدر رقم کوئی شخص ادا کرنے سے معذور ہو تو اس کے قبیلے کی انجمن یا ہمسایہ قبیلے کی انجمن' ورنہ مرکزی انجمن' اس رقم کی ادائیگی کا انتظام کرے گی۔ اسی طرح یہودیوں کے متعلق بھی تفصیل ہے کہ ان پر کیا واجبات و فرائض ہوں گے۔ اس کا بھی ذکر ہے کہ جو مشترکہ دشمن ہیں یعنی قریش مکہ وغیرہ ان کے ساتھ اس مملکت کے باشندوں کا کیا طرز عمل ہوگا۔

یہ تھا وہ نظام جو عہد نبویؐ میں شروع ہوا اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ مملکت ابتدا میں ایک شہری مملکت نہیں تھی بلکہ شہر کے ایک حصے میں قائم کی گئی تھی' لیکن اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہوتی ہے۔ اس توسیع کا آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ صرف دس سال بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت مدینہ ایک شہری مملکت نہیں بلکہ ایک وسیع سلطنت کا دارالسلطنت تھا اس وسیع سلطنت کا رقبہ' تاریخی شواہد کی رو سے تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع

کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ سلطنت کی یہ توسیع کچھ تو پرامن ذرائع سے ہوئی اور کچھ جنگوں کے نتیجے میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا سے متعلق دیگر تفصیلات کے علاوہ مقتولین اور شہداء کے اعداد و شمار بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تین تین کلومیٹر رقبہ فتح کرنے کے لئے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں، ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں تھی۔ دس سال میں ایک سو بیس مہینے ہوتے ہیں تو ایک سو بیس کے دوگنے دو سو چالیس آدمی بھی ان لڑائیوں میں نہیں مرے۔ دشمن کے مقتولین کی تعداد اس سے کم تھی۔ مسلمانوں کے شہداء کی تعداد دشمنوں سے بھی کم تھی۔ مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان جنگ احد میں ہوا کہ ستر آدمی شہید ہوئے اور یہ نقصان بھی مسلمانوں کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ بہرحال بحیثیت مجموعی میدان جنگ میں قتل ہونے والے دشمنوں کی تعداد مہینے میں دو سے بھی کم ہے، جس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اسوۂ حسنہ بن کر دنیا بھر کے حکمرانوں اور فاتحوں کو بتاتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ اور ان کو شکست دینے کی کوشش ضرور کرو لیکن بے جا خون نہ بہاؤ۔ مقصد یہ کہ دشمن جو آج غیر مسلم ہے ممکن ہے کل وہ مسلمان ہو جائے یا اس کے بیوی بچے اور اس کی آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں، لہٰذا اس امکان کو زائل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے پچھتانے کی ضرورت پیش آئے۔

نیا نظام:- ہمارے موضوع کا ایک پہلو تو حکومت کے قیام اور سلطنت کی توسیع سے متعلق تھا، دوسرے پہلو کا تعلق حکومت کے نظم و نسق سے ہے۔ ہم یہاں یہ دیکھیں گے کہ نظم و نسق کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اقدام کئے اور ان کے کیا نتائج نکلے۔ جیسا ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ میں کوئی مملکت پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ قائم فرمائی۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پرانے انتظامات وراثت میں بالکل نہیں ملے۔ فوج، خزانہ اور عدلیہ اور انتظامیہ کے اداروں میں سے کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ ہر چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ہی نقطہ صفر سے پیدا کرنی اور ترقی دینی تھی۔ اس زمانے میں اتنے دفتر اور اتنے محکمے نہیں ملیں گے جو آج بیسویں صدی میں ہمیں اپنے آس پاس نظر آتے ہیں۔ مثلاً آج کل آپ کو سڑکیں بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عرب میں کہیں سڑکیں نہ تھیں۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی جگہ عام خود ساختہ گزر گاہیں تھیں۔ سڑک کی تعمیر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا

اس کے لئے نہ ناظم تھا' نہ محکمہ تعمیرات' البتہ اس کے باوجود کچھ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو شہری منصوبہ بندی کے سلسلے میں کار آمد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شہر کے اندر تم گلیوں کو اتنا چوڑا رکھو کہ دو لدے ہوئے جانور بآسانی گزر سکیں گویا آج کل کے الفاظ میں آسانی کے ساتھ دو موٹریں آجا سکیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قانون سازی صرف دینی معاملات تک ہی محدود نہیں تھی اس میں دنیوی مسائل پر بھی توجہ دی گئی ہے حتیٰ کہ اس میں مکانوں کے درمیان کا راستہ بھی شامل ہے۔ وقت کی کمی کے باعث میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اہم ترین انتظامات میں سے چند کاتبوں پر مشتمل ایک دفتری نظام (سیکرٹریٹ کا) بھی تھا' چنانچہ مسعودی اور دیگر مؤلفوں نے بتایا ہے کہ ان کاتبوں کے فرائض مختلف تھے۔ کچھ لوگ نازل ہونے والی وحی لکھا کرتے تھے۔ کچھ لوگ زکوٰۃ کے اندراجات کرتے' یعنی رقم کس سے وصول ہوئی اور کس پر خرچ کی گئی۔ جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا' اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ سب کو جمع کر کے' اس میں سے سارے فوجیوں کو برابر حصہ دیا جائے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مال غنیمت کی جمع و تقسیم کا حساب رکھا جائے۔ اس کے لئے بھی خصوصی کاتب مقرر تھے۔ اسی طرح کوئی دس بارہ مدوں کی تفصیل دی گئی ہے کہ ان کے لئے الگ الگ کاتب مقرر کئے گئے تھے۔

دیوان کا آغاز:۔ ایک چیز اور جس کا تعلق فوجی نظام سے اور مالی نظام سے ہے اس کا بھی میں ذکر کرتا چلوں۔ اس پر آپ کو حیرت بھی ہوگی عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں دیوان قائم ہوا اور دیوان کا نشاء یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سرکاری خزانے سے سپاہیوں کو پنشن دی جاتی تھی' اس شرط پر کہ وہ چوبیس گھنٹے تیار رہیں کہ جب حکومت انہیں بلائے تو اسی وقت گھربار اور کاروبار چھوڑ کر فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ یہ نظام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے اور اس کے لئے حضر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو دیوان قائم کیا تھا اس کی بہت سی تفصیلیں ہمیں ملتی ہیں۔ لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس کا آغاز بھی عہد نبوی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ "السیر الکبیر" میں آیا ہے کہ عہد نبوی میں ایک کاتب کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ان بالغ لوگوں کی فہرست مرتب کرے جو نہ صرف جنگ کے قابل ہیں بلکہ اس پر آمادہ ہیں کہ جب انہیں بلایا جائے فوراً فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ ایسے لوگوں کو بیت المال سے مستقل وظیفہ ملتا

تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قائم کردہ نظام کو مزید ترقی دی۔ ان کے زمانے میں حکومت کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا وظائف بھی زیادہ دیئے جانے لگے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں غیر مسلموں کو بھی وظائف دیئے جاتے تھے۔ غرض دیوان یا سیکرٹریٹ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا۔ بعض چیزوں کا انتظام حسب ضرورت رضاکارانہ ہوتا تھا مثلاً شروع میں اذان نہیں ہوتی تھی۔ جب نماز کے لئے لوگوں کو ایک مؤذن کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ طے پایا کہ اذان دی جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کام کے لئے منتخب فرمایا' کیونکہ ان کی آواز سریلی تھی کہا جاتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اذان کا طریقہ سکھایا اور یہ بھی بتایا کہ کس لفظ کو کھینچو' کس کو مختصر کرو' گویا موسیقی کی سریں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سکھائیں۔ اسی طرح ایک اور مؤذن بھی مقرر کیا گیا تاکہ ایک ہی آدمی پر اس کی ذمہ داری نہ رہے۔ یہ اور اس طرح کی اور بہت سی چیزیں ہمیں مذہبی نظام کے سلسلے میں ملتی ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر صفائی کی ضرورت تھی۔ ایک حبشی مسلمان عورت نے رضاکارانہ اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ روزانہ مسجد میں جھاڑو دیتی تھی اور قندیل لگائے ہوئے چراغ جلاتی۔ اس طرح کے انتظامات کا بھی ہمیں پتا چلتا ہے جو بالکل ابتدائی حالت میں تھے اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ ان نظامات میں سے ایک نظام فوج کا بھی ہے۔ دفاع کے لئے فوج کی ضرورت تھی' شروع میں اسلامی حکومت کے پاس مال و دولت نہ تھی۔ اس کا حل خدائے حکیم نے یوں کر دیا کہ جہاد کو مسلمانوں کا ایک فریضہ قرار دیا گیا۔ ہر شخص پر واجب تھا کہ اسلام کے دفاع کے لئے اپنی جان اور اپنے مال کو قربان کرے۔ یہ نہیں کہ سو فیصد مسلمان جنگوں میں حصہ لیں۔ لیکن بوقت ضرورت ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو پیش کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطلوبہ تعداد میں لوگوں کو چن لیتے تھے اور انہیں مہم پر روانہ کر دیتے تھے۔

صفہ:۔ اس سلسلے میں "صفہ" کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس کا تعلق تعلیم و تربیت کے علاوہ فوج سے بھی ہے۔ بعض اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اطلاع آتی کہ فلاں کارروائی کے خلاف تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے یعنی دشمن کو سزا دی جائے یا اس کا تعاقب کیا جائے۔ مثلاً کسی نے مدینے کے ایک گھر پر چھاپا مارا تو ضرورت تھی کہ فوراً ہی اس کے تعاقب کے لئے فوج کا

کچھ حصہ روانہ کیا جائے۔ ایسی ہنگامی ضرورت کے لئے "صفہ" کار آمد ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اعلان ہوتے ہی کہ ایک مہم کے لئے اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ فوراً اصحاب صفہ کی ایک جماعت اس مہم پر روانہ ہو جاتی۔ ان کو دن یا رات میں کسی وقت بھی بلایا اور بھیجا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی بڑی مہم بھیجنی ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے تیاریاں کرنی ہوتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے خطبے میں یا کسی نماز کے بعد یا غیر معمولی اجتماع کر کے فرماتے کہ اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے تو لوگ رضا کارانہ اپنے آپ کو پیش کر دیتے۔ اس سلسلے میں یہ دلچسپ چیز ہے کہ ان کے نام اور پتے نوٹ کیے جاتے تھے اور بعد میں اس کے مطابق انہیں اطلاع دی جاتی تھی کہ تم سب لوگ فلاں مقام پر' فلاں وقت اپنے ہتھیار اور ضروری سامان کے ساتھ جمع ہو جاؤ۔ صرف یہی نہیں' فوجی نظام کے سلسلہ میں اور بھی بے شمار باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو ورزش کی ترغیب دیتے تھے۔ نشانہ بازی کے مشق کی بھی ہمیشہ تشویش فرماتے۔ خود بھی وہاں جاتے اور اپنے سامنے گھڑ دوڑ کراتے' اونٹوں کی دوڑ کراتے' آدمیوں کی دوڑ کراتے' کشتی کے مقابلے کرواتے اور لوگوں کو انعامات دیتے تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں آج بھی شمالی دروازے کے پاس ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد سبق ہے۔ سبق کے معنی مسابقت میں جیتنا ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر جو ایک پہاڑی کے دامن میں ہے' بلندی پر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب گھوڑے دوڑتے ہوئے آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فیصلہ فرماتے کہ کونسا نمبر 1 ہے اور کونسا نمبر 2 اور نمبر 3 وغیرہ۔ "مقریزی" نے بیان کیا ہے کہ پانچ اول آنے والے گھوڑوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انعام دیا کرتے تھے اور یہ انعامات کبھی کھجور کی صورت میں ہوتے' کبھی کسی اور چیز کی صورت میں۔

غرض ایک تو فوجی خدمت کا لازمی قرار دیا جانا' دوسرے فوج کی تربیت' یہ دو انتظامات تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت کے زیر اہتمام فوجی ذخیرہ بھی جمع کرنا شروع کیا' مثلاً ہتھیار خریدنا' گھوڑے اور اونٹ خریدنا ان کو سرکاری چراگاہ میں رکھنا' تاکہ بوقت ضرورت اگر سپاہیوں کے پاس ان کی ضرورتوں کی چیزیں ناکافی ہوں تو سرکاری طور پر بھی ان کو مدد دی جائے تاکہ فوج کے انتظامات ناکافی ہونے کی وجہ سے فوج کو نقصان اور تکلیف نہ ہو۔ ایک اور چیز جس کا نظام قائم کیا گیا اور جس کا تعلق سیکرٹریٹ سے ہے وہ ہے بیرونی قبائل اور حکمرانوں کو

خطوط لکھنا اور معاہدات کو لکھنا۔ چنانچہ بیرونی حکمرانوں کو جو خطوط لکھے جاتے تھے۔ ان مکتوبات نبوی کا سب سے قدیم ذخیرہ یا مجموعہ' جو تیار ہوا تھا' اس کو ابو جعفر د یبلی (ایک پاکستانی) نے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد اور لوگ بھی اس میں حصہ لیتے رہے اور انہوں نے بھی مکتوبات نبوی کو جمع کرنے کی سعادت حاصل کی' بیرونی حکمرانوں سے مراسلت ہی نہیں' بلکہ ان کے پاس سفیروں کو بھیجنا بھی ضروری تھا۔ اس کا تعلق بھی سیکرٹریٹ سے تھا اور ہمیں ایسے متعدد لوگوں کے نام ملتے ہیں جو سفیر بنے۔ اس سلسلے میں ایک چیز جو دلچسپ اور قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ غیر مسلموں کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفیر بنا کر بھیجتے تھے۔ غالباً غیر مسلموں میں سے بعض قابل اعتماد شخصیتوں کی فطری صلاحیتوں کی پیش نظر ان کو سفیر بنایا جاتا تھا۔

مالیات:- سلطنت کے جو مختلف انتظامات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ان میں مالئے کے ذکر کی ضرورت ہے' تعلیم کے ذکر کی بھی ضرورت ہے اور عدل گستری کے انتظام کا ذکر بھی لازمی ہے اور بھی انتظامات تھے لیکن یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن پر کچھ کہے بغیر یہ تبصرہ بہت ہی نامکمل اور تشنہ رہے گا۔ جہاں تک مالئے یعنی حکومت کی آمدنی اور اس آمدنی کے خرچ کا تعلق ہے یہ بہت ہی آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ زکوٰۃ جو اسلامی آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے' یہ ۹ھ میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی دو تین سال پہلے فرض کی گئی۔ اس سے پہلے کیا ہوتا رہا۔ اس کا جواب مشکل ہے' بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن مجید کی مکی آیتوں میں بھی زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اس لئے تصور کیا جا سکتا ہے کہ شروع میں مسلمان زکوٰۃ یا ٹیکس ادا کرتے تھے' لیکن نہ تو اس کی مقدار معین تھی' نہ وقت مقرر تھا۔ ہر شخص خوش دلی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حتی الامکان کچھ نہ کچھ رقم یا بعض چیزیں پیش کر دیا کرتا تھا۔ میں "بظاہر" کہتا ہوں اس لئے کہ کوئی صراحت اس بارے میں ہمیں ابھی تک نہیں ملی اسی طرح آمدنی کا ایک وسیلہ اور بھی تھا جو مستقل نہیں وقتی تھا۔ یعنی مال غنیمت کا جو حصہ حکومت کو ملتا وہ حکومت کے خزانے میں جمع کیا جاتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مملکت اور ملت کی ضرورتوں پر اس کو خرچ کرتے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں یہ رواج تھا کہ مال غنیمت کو ہر جنگ میں حصہ لینے والا' سپاہی' جتنا وہ لوٹتا اور حاصل کر سکتا تھا' خود لے لیتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کو جمع کر کے سارے سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے۔ البتہ ایک پابندی تھی وہ یہ کہ سپہ

سالار کو ہر سپاہی اپنے مال کا نصف حصہ دینے پر مجبور تھا' جسے ربع کا نام دیا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصلاح فرمائی وہ سیاسی نقطہ نظر سے ایک غیر جانبدار ناظر کے لئے بھی دلچسپ ہے۔ آپؐ نے اولاً یہ فرمایا کہ حکومت کو چوتھائی نہیں پانچواں حصہ ملے۔ اس میں ایک ذیلی فائدہ یہ تھا کہ اگر غیر مسلم رضا کارانہ طور پر جنگ میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اگر ہمارے دشمن کی فوج میں شریک ہوں تو انہیں چوتھائی حصہ دشمن کے سردار کو دینا پڑے گا' وہی لوگ اگر اسلامی فوج میں آئیں تو 1/4 نہیں 1/5 حصہ دینا پڑے گا۔ اس طرح انہیں اسلامی فوج میں شریک ہونے کے لئے ایک تشویق ہوگی۔ اس اصلاح کا دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ مال غنیمت انفرادی نہ سمجھا جائے بلکہ سارے لوگوں کا جمع کیا ہوا مال غنیمت سارے لوگوں کے لئے ہو' حتیٰ کہ ان لوگوں کے لئے بھی ہو جو کسی نہ کسی وجہ سے جنگ میں عملی حصہ نہیں لے سکے' مثلاً جنگ کے وقت ہمارے کیمپ کی حفاظت کی ضرورت ہے تاکہ دشمن وہاں کے مال و اسباب' جانوروں' بچوں اور عورتوں کو نقصان نہ پہنچائیں اور اس کیمپ کی حفاظت کے لئے چند سپاہیوں کو متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو جنگ میں عملی حصہ نہیں لیتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مال غنیمت کو یکجا کیا جائے اور پھر سارے لوگوں کو اس میں برابر کا حصہ دیا جائے۔ سپہ سالار اور معمولی سپاہی میں کوئی فرق نہ ہونے پائے۔ چنانچہ سپہ سالار کو بھی اتنا حصہ ملتا جتنا معمولی سپاہی کو۔ اگرچہ فوج کی جماعتیں ہوتی تھیں اور ان جماعتوں کے سردار نامزد ہوتے تھے لیکن ان کی حیثیت بھی مال غنیمت کی حد تک معمولی سپاہیوں سے زیادہ نہ تھی اور اگر فرق کیا جاتا تھا تو اس امر کا کہ جس کے پاس گھوڑا ہوتا' اس کو مال غنیمت میں سے زیادہ حصہ ملتا تھا۔ آمدنی کے ایک تیسرے وسیلے کا بھی امکان ہے اور وہ یہ کہ ملک میں جو زراعت ہوتی تھی۔ اس کی پیداوار کا ایک حصہ زمانہ قدیم سے اہل عرب کسی نہ کسی کو دینے پر مجبور تھے' مثلاً مکہ میں بتوں کے اوپر چڑھاوے کے طور پر کچھ پیداواری جاتی تھی۔ غالباً مدینے میں بھی ایسا ہوا ہوگا کہ لوگ اپنی پیداوار کا کچھ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوں گے تاکہ دینی خدمت کے لئے اس کو صرف کیا جائے۔ یہ ابتدائی انتظامات تھے۔ ان انتظامات کے سلسلے میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کردوں گا۔ حکومت کی آمدنی کی نگہداشت کی بھی ضرورت تھی اور یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے سپرد تھا جو مؤذن بھی تھے اور وزیر خزانہ بھی۔ لکھا ہے کہ مسجد نبوی کا ایک حجرہ اس کے لئے مخصوص تھا جس میں تالا پڑا رہتا۔ یہ کمرہ حضرت

بلال رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں رہتا اور اس میں سرکاری رقم اور سرکاری ملکیت کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ بہت عرصے بعد' ہمارے بعض مفسروں کے بیان کے مطابق 9ھ میں زکوٰۃ کی آیتیں نازل ہوئیں کہ زکوٰۃ ایک واجبی چیز ہے اور زکوٰۃ ہر شخص کو دینا پڑے گی جو نصاب کا مالک ہوگا۔ یہ رقم مختلف قسم کی ہو سکتی ہے' مثلاً زراعتی ہو تو اس کے لئے پیداوار کا ایک حصہ ادا کرنا ہوگا۔ اگر تاجر ہے تو اس کو اپنے سرمایہ تجارت پر رقم دینا ہوگی۔ کسی کے پاس لوہے' سونے یا اس زمانے کے لحاظ سے کسی اور چیز کی کانیں ہیں تو اس کی ایک مقدار حکومت کو دینی ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں شہر مدینہ سے باہر ساری مملکت کے لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے تحصیل دار بھیجے جاتے تھے۔ بعد میں مقامی محصل متعین ہوئے۔ غرض یہ کہ حکومت کے مالئے کے سلسلہ میں ایک طرف تو آمدنیاں تھیں اور دوسری طرف خرچ۔ قرآن مجید میں آمدنی کے متعلق بہت کم اشارے ملتے ہیں لیکن خرچ کے متعلق ایک صریح حکم موجود ہے۔ **انما الصدقات للفقراء و المساکین' العاملین علیھا و المولفۃ قلوبھم و فی الرقاب و الغارمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل فریضۃ من اللہ** اس آیت کو ہم اسلامی بجٹ کے اخراجات کی اساس قرار دے سکتے ہیں۔ انشاء اللہ کسی آئندہ لیکچر میں اس آیت کے ہر ہر لفظ پر تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ غرض یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکومت قائم کی تھی اس کے شعبہ مالیہ پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ علاوہ ان مستقل ذرائع آمدنی کے ایک اور چیز بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ کسی خاص موقعہ پر ایک رقم کی ضرورت ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے اور مسلمانوں کو شوق دلاتے کہ ملک کی فلاں ضرورت کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔ اس سے ایک بات یاد آئی جس کا ذکر کرتا چلوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ اس زمانے کے مسلمان کیسے تھے۔ جنگ تبوک کا ذکر ہے' دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں میں سے ایک یعنی بازنطینی سلطنت سے جنگ چھڑ گئی ہے۔ عرب کے بے خانماں بدوی مسلمانوں کو دشمن سے مقابلے کے لئے ایک مہینے کی مسافت طے کر کے بازنطینیوں کی سرحد تک پہنچنا ہے۔ شدید گرمی کا زمانہ ہے۔ وسائل نقل و حمل کی ضرورت ہے' تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دلائی کہ اللہ کی راہ میں دل کھول کر حصہ لو' انہوں نے حصہ لیا اور جنگ کامیاب رہی۔ جن لوگوں نے چندہ دیا ان میں سے صرف تین مثالیں میں آپ کو دیتا ہوں۔ سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے۔ بہت ہی مال دار تاجر اور بہت ہی مخیر دیندار آدمی تھے۔ اسلام کی

ہمیشہ دل کھول کر مالی خدمت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے جہاں تک یاد ہے اس وقت چالیس ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ ظاہر ہے یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ آج بھی ہم اسے بڑی رقم کہہ سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور علاوہ اور باتوں کے' دعا دینے کے بعد فرمایا کہ آج سے تم جو چاہو کرو' خدا نے تمہیں معاف کردیا۔ اس سے بڑھ کر انہیں کیا مسرت ہوسکتی تھی کہ اس تھوڑے سے مال کے عوض' جو ان کا سارا مال نہیں تھا' بلکہ صرف ایک جزو تھا' یہ عظیم بشارت آپؐ سے حاصل کی تھوڑی دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے انہوں نے دس ہزار درہم پیش کئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سوال پر کہ اہل و عیال کے لئے بھی کچھ چھوڑا ہے انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ میری آدھی جائیداد ہے۔ آدھا حصہ اہل و عیال کے لئے چھوڑا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے ان کو بھی دعا دی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آتے ہیں اور صرف پانچ سو درہم کی رقم پیش کرتے ہیں' زیادہ نہیں' نہ چالیس ہزار اشرفیاں جس کے معنی ہیں چالیس لاکھ درہم نہ دس ہزار درہم بلکہ پانچ سو درہم۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سول پر کہ گھر میں کیا چھوڑ آئے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں ظاہر ہے کہ اس شخصیت کا دنیا کے کسی انسان کے ساتھ ہم مقابلہ نہیں کرسکتے۔ نبی کے بعد کے مرتبے کا کوئی شخص ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے جو اللہ کی راہ پر اپنی ہر چیز قربان کردیتا ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کو پھیلایا۔

تعلیم:۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس کا پہلا لفظ "اقرا" تھا یعنی پڑھو۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری عمر امت میں لکھنے پڑھنے اور تعلیم کو رائج کرنے کی سعی میں گزری دو ایک مثالیں میں آپ کو دوں گا۔ مدینہ منورہ پہنچے تو سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر کا تھا اور اس مسجد کے اندر "صفہ" ایک حصہ تھا جو تعلیم کے لئے مخصوص تھا۔ "صفہ" چبوترے یا پلیٹ فارم کو کہتے ہیں۔ مسجد کے ایک حصے میں ڈائس کے طور پر ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا جو دن کے وقت تعلیم گاہ کا کام دیتا اور رات کے وقت بے خانماں لوگوں کے لئے سونے کی جگہ بنتا۔ گستاخی معاف! گویا یہ پہلی اقامتی (Residential) یونیورسٹی تھی جو رسول اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی۔ پہلے ہی دن سے شہر کے باشندے بھی وہاں آنے لگے۔ بے خانماں لوگ حصول تعلیم کے لئے وہیں رہتے تھے۔ مختلف لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر مختلف قسم کی تعلیم دی

جاتی۔ جو لوگ بالکل ہی ان پڑھ تھے ان کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا۔ اس کا بھی وہاں انتظام تھا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان میں سے کسی کو قرآن پڑھ کر اس کے معنی سمجھائے جاتے' یعنی تفسیر کی تعلیم دی جاتی' کسی کو کچھ' کسی کو کچھ' بعض بڑی اہم اور اثر انگیز مثالیں ملتی ہیں۔ ایک صاحب کو اس بات پر مامور کیا گیا کہ وہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں چونکہ وہ بہت خوش نویس تھے۔ ایک اور صاحب کو قرآن کی تعلیم پر مامور کیا گیا۔ ایک دن وہ آکر کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے ایک شخص کو قرآن کی تعلیم دی اور اس نے اظہار تشکر کے طور پر مجھے ایک کمان دی ہے کہ اللہ کی راہ میں اس سے جہاد کروں۔ کیا میں اسے لے سکتا ہوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آگ کی کمان ہے' نہ لو۔ چنانچہ وہ دوڑے ہوئے گئے' اسے شاگرد کو واپس کر دیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے وضاحت کر دی تھی کہ میرا شاگرد چاہتا ہے کہ میں اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں ایک شائبہ یہ ہے کہ تم تعلیم کا معاوضہ لینا چاہتے ہو۔ ابتداء میں ہر چیز رضا کارانہ طور پر تھی۔ ممکن ہے بعد کے زمانے میں جب حکومت کی طرف سے' مدینے میں بھی اور مدینے سے باہر بھی۔ تعلیم دینے کے لئے اساتذہ مامور کئے گئے تو انہیں حکومت کی جانب سے تنخواہیں دی جاتی ہوں لیکن تعلیم کے سلسلے میں شاگردوں سے کچھ لینے کی صریحاً" ممانعت کی گئی۔ تعلیم کے انتظام کے بارے میں ایک مثال دیتا ہوں' حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو یمن میں انسپکٹر جنرل آف ایجوکیشن کے طور پر بھیجا جاتا ہے ان کا فریضہ حسب بیان طبری یہ تھا۔ "**کان ینتقل من عمالتہ عامل الی عمالتہ اخری**" ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں' ایک کمشنری کے ایک عہدیدار کے علاقے کے بعد دوسرے عہدیدار کے علاقے میں جاتے تھے اور وہاں تعلیم کا بندوبست اور انتظام کرتے تھے۔ جب یمن کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ اور صوبوں میں بھی ایسا ہی انتظام کیا گیا ہو گا' اور اسی نہج پر ہوا ہو گا کہ مقامی مدرس بھی مامور کئے جائیں۔ صدر مدرس بھی اور مدرسوں کے ناظر وغیرہ بھی مامور کر دیئے گئے ہوں گے تاکہ حکومت کی نگرانی بھی تعلیم پر رہے اور اگر کوئی شکایت یا خرابی نظر آئے تو اس کی اصلاح اور سدباب بھی کیا جاسکے۔

عدلیہ:۔ اب عدلیہ کے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا۔ اس کی بھی ضرورت پیش آئی اور اس کا

بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوبست کیا۔ ابتداء میں مسلمانوں کی تقریباً ساری آبادی شہر مدینہ میں تھی ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ مسلمانوں میں تو لڑائی جھگڑے کا سوال ہی نہیں ہونا چاہئے لیکن انسانی فطرت کے تقاضے سے اگر کبھی کوئی جھگڑا ہو جاتا تو لوگ یا تو اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کرتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور فی الفور وہ مقدمہ طے پاجاتا اور فیصلہ نافذ کیا جاتا۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ اعلیٰ ترین افسر عدالت' حکمران ملک یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی شکایتیں پیش کرے اور فیصلہ پالے۔ رفتہ رفتہ جب سلطنت کی توسیع ہوئی تو مختلف مقامات پر عدالتی انتظامات کی ضرورت پیش آئی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ جب یمن کے علاقے نجران کے عیسائی مدینہ منورہ آئے تو انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا' لیکن اسلامی مملکت کے ماتحت رہنے کو قبول کرلیا۔ کچھ شرطیں بھی طے کیں کہ ہمارا اگرجا برقرار رہے۔ اپنے گرجاؤں کے سردار کو ہم ہی متعین کریں گے وغیرہ آخر میں انہوں نے کسی مسلمان حاکم عدالت کی غیرجانبداری پر اعتماد کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں ایک مسلمان جج مہیا کیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو روانہ کرتے ہیں کہ وہ "امین ہذہ الامتہ" یعنی مسلمانوں میں قابل اعتماد شخص ہیں۔ انہوں نے وہاں اپنے فرائض اس خوبی سے انجام دیئے کہ ملک میں جلد ہی اسلام پھیلنے لگا۔ بہت سے عیسائی مسلمان ہوگئے' مختلف مقامات کے قاضیوں کو مختلف ہدایت دی جاتی رہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ایک جگہ کا قاضی بنا کر بھیجا گیا۔ یہ بالکل نوجوان تھے' جب انہیں قاضی نامزد کیا گیا تو کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تو کبھی یہ کام کیا ہی نہیں' یہ خدمت کیسے انجام دوں گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا کہ ایک بنیادی اصول میں تمہیں بتاتا ہوں۔ جب کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور کوئی شکایت پیش کرے تو صرف اسی کی بات سن کر فیصلہ نہ کرو۔ جب تک مدعا علیہ یا فریق ثانی کو بھی بلا کر اس کا بیان نہ سن لو پھر دونوں کے بیانات کی روشنی میں تم اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرسکتے ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں ساری عمر عدالتی فیصلے کرتا رہا ہوں مجھے کبھی جھجک نہیں ہوئی' کیونکہ بنیادی اصول یہ تھا کہ دونوں آدمیوں کی باتیں سنوں اور اس کی روشنی میں صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کروں۔

یہ تمام امور تھے جن کی اساس پر اسلامی مملکت کے مختلف محکموں اور مختلف اداروں کا آغاز ہوا تھا، تعلیم کا بھی آغاز ہوا اور فوج کا بھی انتظام ہوا۔ مالیے کا بھی انتظام ہوا اور سرکاری سیکرٹریٹ کا بھی انتظام ہوا۔ غرض جن جن چیزوں کی اس وقت ضرورت تھی ان میں ہر ایک کا حسب ضرورت انتظام کیا جاتا تھا۔ بعد کے زمانے میں جو ترقی یافتہ انتظامی ادارے نظر آتے ہیں' ان سب کی بنیاد عہد نبوی ہی میں پڑ چکی تھی۔

باب 2

نظام مالیہ و تقویم

مالیات اس بناء پر ایک اہم موضوع ہے کہ قرآن مجید میں مال کو انسانیت کی بقا اور انسانیت کے قیام کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے..... **واموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما**...."(5:4) اس لحاظ سے قرآن میں ہی اس چیز کا اب سے چودہ سو سال پہلے ذکر آچکا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر زمانہ حال میں لوگوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے' لہٰذا کمیونسٹ بننا چاہیئے تو میں کہوں گا کہ اب سے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کو ان کے دین نے یہ بتا دیا تھا کہ زندگی ایک دن بھی مال کے بغیر نہیں گزر سکتی۔ البتہ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پرانے ادیان کی پالیسی اور اسلام کی پالیسی میں کیا فرق پایا جاتا ہے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ آیا اسلامی احکام بہتر تھے یا نہیں' اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا اور وہ ایک طرح سے معذرت ہو گی۔

اسلامی مالیات پر ہمارے فقہا نے نہایت قدیم سے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج" یحییٰ ابن آدم القریشی کی کتاب "الخراج" ابو عبید قاسم بن سلام کی کتاب "الاموال" اور اسی طرح کی اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں' کئی ایک چھپ بھی چکی ہیں۔ مجھے ان ساری کتابوں میں ان کے مولفوں کا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ایک کوتاہی نظر آتی ہے' وہ یہ کہ انہوں نے تاریخی نقطہ نظر کو ملحوظ نہیں رکھا' یعنی یہ کبھی نہیں بتایا کہ عہد نبوی میں مالیات کے متعلق ابتدائی صورت یا ہجرت سے پہلے مکہ میں کیا صورت تھی۔ مدینہ آنے کے بعد ابتداء کیا تھی' رفتہ رفتہ کیا تبدیلی ہوئی اور اس نے کیا صورت اختیار کی۔ ان باتوں کا وہ کہیں بھی ذکر نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہمارے دلوں میں خلش رہ جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے مورخ اور

ہمارے فقہا بھی کہتے ہیں کہ زکوۃ (مدنی) میں فرض ہوئی۔ "آمنا و صدقنا" لیکن آپ قرآن مجید کی مکی صورتوں میں بھی لفظ زکوۃ کا استعمال پاتے ہیں تو مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ میں اسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کروں گا کہ عہد نبوی میں مالیہ کا کس طرح آغاز ہوا۔ باقی تفصیلات پر ضخیم کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ اگر یہ سب تفصیلات بیان کرنا چاہوں تو کئی ہفتے درکار ہوں گے۔

رضا کارانہ نوعیت:۔ زکوۃ کا ذکر ہم کو مکی سورتوں میں بھی ملتا ہے۔ قدیم مذہبی صحیفوں میں بھی ذکر موجود ہے۔ قرآن میں ابتدائے زکوۃ کے بارے میں صرف اشارے ملتے ہیں مثلاً ایک آیت ہے..... **و تو احقہ یوم حصادہ**....." (141:6) (جب تم زراعت کی فصل کاٹ لو تو اللہ کا حق اس میں سے ادا کرو) یہاں "اللہ کا حق" سے مراد زکوۃ ہی ہے۔ اس طرح اور بھی آیتیں ہمیں ملتی ہیں جن میں صرف ایک لفظ "زکوۃ" نہیں' کئی اور لفظ اس کے مترادف کے طور پر قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک معروف ترین لفظ "صدقات" ہے۔ انما الصدقات للفقراء والمساکین....." (60:9) یہاں صرف صدقہ و خیرات دینا بالکل مراد نہیں بلکہ زکوۃ کا ذکر ہے۔ اسی طرح خذ من اموالھم صدقہ....." (103:9) یہاں "صدقہ" کا لفظ گویا زکوۃ کے معنی میں ہے اسی طرح لفظ "انفاق" بھی ہمیں اسی معنی میں کئی جگہ ملتا ہے۔ غرض یہ کہ مکی دور میں اور مدنی دور میں کبھی ایک لفظ استعمال ہوتا ہے' کبھی دوسرا لفظ اور اس کو سمجھے بغیر ہمیں دشواریاں پیش آسکتی ہیں دوسری چیز جو اتنی ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ اگر مکہ ہی میں زکوۃ فرض ہوچکی تھی جس معنی میں ہم فرض سمجھتے ہیں تو اس کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یعنی مکہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کچھ اس کی وصولی اور خرچ کا انتظام کیا گیا ہو یا اس کی مقدار معین ہو' اس کی میعاد مقرر ہو' اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ان حالات میں مجبوراً اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے (اور یہ میری ذاتی رائے ہوگی۔ آپ پابند نہیں کہ اسے قبول بھی کریں) کہ زکوۃ کی ابتداء اور اس کا آغاز اخلاقی اور رضا کارانہ اساس پر شروع ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اپنی تجارت زراعت اور دیگر کمائیوں سے خدا کی راہ میں خرچ کرو اور کوئی تعجب نہیں کہ کبھی کبھی مسلمان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مال پیش کرتے ہوں تاکہ اپنی صوابدید سے اس مال کو خرچ کریں اور کبھی خود ہی اپنی صوابدید سے خرچ کرتے ہوں۔ کن لوگوں میں زکوۃ تقسیم کرنی مناسب ہے' اس بارے میں کوئی صراحت نہیں ہوئی تھی زمانہ جاہلیت میں نیک دل' شریف اور مخیر

لوگ جس طرح اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے' اسی طرح خرچ کرتے رہے تو وہی اسلامی طریقہ بھی رہا۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت کی ہر اچھی چیز کو اسلام Confirm کرتا ہے۔ لفظ زکوٰۃ شروع میں ٹیکس کی بجائے ایسی چیز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس سے ہمارا تزکیہ نفس ہوسکے۔ اس میں اخلاقی عنصر زیادہ ہے۔ سرکاری و قانونی دباؤ اور جبر کا عنصر نہیں۔ جب یہ چیز ذہنوں میں راسخ ہو جاتی ہے کہ دوسرے انسان کی مدد کرنا' غریبوں محتاجوں کا حتی الامکان ہاتھ بٹانا' واجب کردہ امر ہے' تو پھر رفتہ رفتہ اس میں اور عناصر بڑھتے جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ اس کو کس زمانے میں دیا جائے' کس شرح سے دیا جائے؟ اس کے مستحق لوگ کون ہیں؟ یہ مسائل رفتہ رفتہ پیدا ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ ایک طرح سے رضا کارانہ چیز ہی تھی اور کسی پر کوئی جبر نہیں تھا۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ یاد دلاؤں گا کہ زمانہ جاہلیت میں' مشرکوں کے ہاں بھی ایک طرح کی زکوٰۃ پائی جاتی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی پیداوار کا ایک حصہ اپنے بتوں کو دیتے تھے۔ کچھ اللہ کے لئے رکھتے تھے' کچھ حصہ بتوں کے لئے اور پھر قرآن نے طنز کیا ہے کہ اگر اتفاقاً'' کسی وجہ سے بتوں کا کچھ حصہ اللہ کے حصہ میں پڑجاتا ہے تو اسے لے کر دوبارہ بت کو دے دیتے ہیں۔ لیکن اگر مثلاً ہوا کے چلنے سے یا کسی اور وجہ سے اللہ کا کچھ حصہ بتوں کے پاس چلا گیا تو اللہ کو نہیں دلاتے' بتوں کو دیتے ہیں۔ یہ صورت مکہ میں رہی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو حالات بدلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں ایک تو مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہے دوسرے مسلمانوں کی ضروریات بڑھتی ہیں' تیسرے مسلمانوں کے دفاع وغیرہ کے لئے مال کی طلب پیدا ہوتی ہے' چوتھے یہ کہ مسلمانوں کے مالی وسائل بھی بڑھ جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں بہت سے مالدار مسلمان تھے جو زراعت پیشہ تھے' باغات اور زراعت پیشہ تھے' باغات اور زراعت سے انہیں کافی آمدنی ہوتی تھی اور وہ معین طور پر اس کا کچھ حصہ دے سکتے تھے۔ لیکن مدینہ منورہ میں بھی ابتداء زکوٰۃ گویا ایک خیرات' ایک رضا کارانہ چیز اور ایک غیر معین فریضہ تھا۔ کتنی مقدار میں دیں' کب دیں' کس کو دیں' رفتہ رفتہ ان باتوں کی اہمیت بڑھتی جائے گی اور اس میں وہ عناصر آجائیں گے جن کی بنا پر ہم آخر میں زکوٰۃ کو آج کل کے ٹیکس سے الگ چیز نہیں سمجھتے جس طرح آج کل اگر کوئی شخص ٹیکس دینے سے انکار کرے تو حکومت جبر کرکے اس سے وصول کرتی ہے' جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ابتدائی زمانہ

خلافت میں ہوا کہ انہوں نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اور بالجبر زکوٰۃ وصول کی۔

ہجرت کے فوراً بعد:۔ ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ جب مسلمان مکے سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو عام مہاجرین کی بے روزگاری اور ان کی مصیبت زدگی کا ازالہ کیا گیا اور مواخات کے ذریعے سے مدنی مسلمانوں کے خاندانوں میں ان مکی مہاجرین کے خاندانوں کو ضم کر کے ان دو خاندانوں کو ایک خاندان بنایا گیا۔ یہ خاندان مشترکہ طور پر کمائی کرتے تھے اور رہتے تھے۔ اب یہ سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہو گا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بسر و بود کس طرح کیا کرتے تھے اور ان کے وسائل آمدنی کیا تھے؟ شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک مستشرق جو سویڈن کا ہے لکھتا ہے کہ ابتداء' مسلمان نہایت ہی غریب تھے۔ لہٰذا لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوجیں بھیجتے تاکہ قافلوں کو لوٹ لیں' کیونکہ وہ مجبور تھے اور ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ بیان اسلام کے بارے میں بہت سخت اعتراض کا ہے کہ دوسروں سے تو وہ کہتا ہے کہ انصاف کر وا اپنے آپ کو ہر چیز کا مجاز سمجھتا ہے۔ لیکن اس اعتراض میں صداقت نہیں' مسلمانان مدینہ کے سلسلے میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کے پاس گزر اوقات کے وسائل تھے۔ ان کی زمینیں تھیں اور وہ کاشت و زراعت کرتے تھے۔ مکی مہاجرین جو آئے تھے وہ بھی اس کام میں مشغول ہو گئے۔ کچھ لوگ تجارت کرنے لگے' کچھ لوگ جو مثلاً حرف پیشہ تھے' جوتے وغیرہ بنانے لگے اور کچھ نجاری و صناعی وغیرہ کرنے لگے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عام طور پر ہماری تاریخی کتابوں میں کم از کم ملتا ہے' اس لئے ابتدا میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ رسولؐ اللہ جب مکہ سے مدینہ پہنچے تو ابتدا میں شہر کے جنوبی حصہ "قبا" میں قیام فرمایا۔ بعض روایات کے مطابق وہ تین ہفتے وہاں مقیم رہے مگر میں ایک مؤرخ کی بیان کردہ روایت کو شخصاً" ترجیح دیتا ہوں وہ صرف چار دن کے قیام کا ذکر کرتا ہے۔ دو شنبے کے دن وہاں پہنچے اور جمعہ کے دن وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اکثر یہ ذکر آتا ہے کہ جب آپؐ مدینہ کی طرف یعنی موجودہ مسجد نبوی کی طرف روانہ ہوئے تو جمعہ کا دن تھا۔ ظہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور وہیں راستے میں لوگوں کو باجماعت نماز پڑھائی۔ اس کے بعد آپؐ آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں پہنچتے ہیں اور وہاں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں قیام فرماتے ہیں۔ وہ اونٹنی کا قصہ وغیرہ

جو ذیلی تفصیلیں ہیں مجھے ان سے بحث نہیں ہے۔ اس بارے میں یہ امر واضح ہے کہ جب آپؐ پہلے پہل "قبا" میں پہنچے اور چار دن یا دو تین ہفتے وہاں مقیم رہے تو مقامی لوگوں نے جو مسلمان تھے، نہایت ہی احترام کے ساتھ مہمان نوازی کے طور پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے پینے کی چیزیں پیش کیں۔ اس طرح مہمان نوازی کی وجہ سے وقت گزر گیا۔ اس وقت یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ رسول کریمؐ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔ جب آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں بستے ہیں تو صحیح بخاری کے مطابق یہ آپؐ کی ننہال کا گھرانا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ماں ایک مدنی خاتون تھیں اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ مدینے کے ایک خاندان سے قائم تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد سے ہر زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اس رشتے کے ساتھ اپنے تعلقات کو برقرار رکھتا تھا چنانچہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جب کبھی شمالی سفر پر جاتے، مثلاً مکہ سے شام کو جاتے، تو جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی، مدینہ میں اپنے خاندان کے پاس ٹھہرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے تعلقات دوستانہ اور قریبی تھے۔ ان حالات میں صحیح بخاری کے اس بیان پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار کی بستی میں ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں اس لئے قیام فرمایا کہ وہ آپؐ کی ننہال کا خاندان تھا، میں اس اونٹنی کے قصے کا ذکر فی الوقت ترک کرتا ہوں، بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ جب ایک قریبی رشتہ دار کے مکان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرماتے ہیں تو وہاں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل زندگی کیا ہیں؟ یقیناً قریبی رشتہ داروں نے آپؐ کی ضیافت کی ہوگی، بغیر اس کا مطالبہ کئے کہ ہمیں اس کے مصارف دیئے جائیں، اسے وہ اپنے لئے باعث فخر بھی سمجھتے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں مہمان ہیں۔ یہ سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر ایک بڑی مسجد بنانے کا حکم دیا۔ سارے شہر مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے باعث، جو لوگ پہلے محلے والی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، وہ بھی اس مرکزی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے آنے لگے تھے۔ چھوٹی مسجد کافی نہیں

ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ایک بڑی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس مسجد میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہنے کے لئے چند کمرے بنائے گئے۔ یہ کمرے ابتداء میں تو اتنے بڑے نہیں تھے جو بعد میں نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد' دوسری بیوی جس سے شادی ہو چکی تھی لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی تشریف لے آئیں' یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کے لئے بھی کمرے کی ضرورت تھی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دو صاحب زادیاں تھیں' حضرت فاطمہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کے لئے بھی ایک کمرہ بنایا گیا۔ دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں رہیں' بعد میں کبھی ان حجروں میں رہنے والوں کی تعداد گھٹے گی۔ مثلاً لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں گی' کبھی ان کمروں کی تعداد نئی بیویوں سے زواج عمل میں آنے کے باعث بڑھ جائے گی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نو بیویاں تھیں اور ایک کنیز حضرت ماریہ قبطیہ بھی۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ توضیحوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کا تعلق ہے' بہ صراحت بیان کیا گیا ہے کہ وہ مسجد نبوی کے حجروں میں نہیں رہتی تھیں بلکہ کسی قدر فاصلے پر' ان کا علیحدہ مکان تھا۔ اسی طرح جہاں تک مجھے اس وقت یاد آ رہا ہے' حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان علیحدہ تھا' وہ بھی ان حجروں میں نہیں رہتی تھیں۔ مسجد نبوی کے ان کمروں میں ایک کمرہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے لئے تھا اور ایک کمرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کے لئے تھا۔ ایک اور کمرہ بنایا گیا تھا' جس میں جلد ہی اس کا مقیم آ گیا یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' تو ابتداء تین حجرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان سے اٹھ کر یہاں آ گئے۔

گزر بسر کا انتظام:۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی بسر بود کا کیا انتظام تھا؟ لکھا ہے کہ مدینہ کے انصار جو کسان تھے اور زراعت پیشہ تھے۔ ان میں سے اکثر نے جو کافی مالدار تھے' اپنے باغوں میں ایک ایک درخت کو نشان زدہ کر دیا تھا کہ اس کا پھل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے انہوں نے ایسا کیا تھا اور ہر سال کھجور کی

فصل کٹنے پر' اس درخت سے جتنی کھجوریں حاصل ہوتیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچا دی جاتیں۔ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت سے زائد ہوتیں تو غربا اور مہمانوں میں تقسیم ہوتیں۔ یہ پیش کش برابر جاری رہی۔ ہمارے مؤرخ اور محدث اکثر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں کہ بعض اوقات مہینے گزر جاتے اور ہم صرف دو چیزوں پر اکتفا کرتے تھے یعنی کھجور اور پانی پر' ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ غالباً اس زمانے کا ذکر ہے' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل آمدنی میں صرف کھجوریں ہوا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں چند اور تفصیلیں نظر آتی ہیں' مثلاً اس کا پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بکریاں خریدی تھیں اور ان کا دودھ خاندان میں خرچ ہوتا تھا۔ اس طرح اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی اونٹنی' کوئی بکری جو دودھ دینے والی ہوتی' پیش کرتے اور التجا کرتے کہ اس کو قبول فرمایئے' اس طرح ہماری عزت افزائی ہوگی' تو کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قبول فرمالیتے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ شروع میں مثلاً ایک بکری تھی' بعد میں دس بکریاں ہوگئیں۔ شروع میں ایک اونٹنی تھی بعد میں چار اونٹنیاں ہوگئیں۔ اب ان کے لئے ہمیں تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ شہرمدینہ کے مضافات میں ایک چراگاہ معین کی گئی جہاں ایک صحابی رضا کارانہ طور پر ان جانوروں کی نگہداشت کرتے' انہیں چرانے کا فریضہ انجام دیتے اور روزانہ دودھ اس مقام سے مدینہ لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پہنچایا کرتے تھے۔ اہل خاندان اس دودھ کو استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بنی نجار ہی کے ایک فرد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی ننھیالی رشتہ دار تھے' ان کی عادت تھی کہ روزانہ اپنے گھر میں پکی ہوئی چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر بھیجتے۔ کبھی کوئی میٹھی چیز' کبھی ترکاری' کبھی گوشت' بہرحال جو بھی اچھی چیز ان کے گھر پکتی تھی ضرور بھیجتے وہ بہت مالدار شخص تھے۔ بعض وقت جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ اسی' اسی اصحاب صفہ کو بیک وقت اپنے گھر لے جاکر ان کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ان کا طریق تھا کہ روزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کی کچھ چیزیں

بھیجتے' جو اچھی خاصی مقدار میں ہوتی تھیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور ان کے گھر کے لوگوں کے لئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے اوقات میں تنہا کھانا' کھانا کبھی پسند نہ فرماتے۔ ہر وقت دس پانچ لوگوں کو جو اس وقت موجود ہوتے بلا لیتے' کبھی کچھ گھر کی چیز کھجور وغیرہ' کچھ وہ تحفے جو روز بروز آتے تھے' وہ بھی کھانے کے طور پر استعمال ہوتے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔

جلد ہی ایک چھوٹے سے ذریعہ آمدنی کا اضافہ ہوتا ہے۔ 2 ہجری رمضان کے مہینے سے دشمنوں کے ساتھ جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جنگ کے مال غنیمت کا 1/5 حصہ حکومت کے لئے وقف تھا اور 4/5 حصہ مجاہدوں میں برابر برابر تقسیم کیا جاتا تھا۔ بیشتر جنگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شخصا" شریک ہوئے۔ مثلاً بدر میں اور اس کے بعد مختلف غزوات میں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دو طریقے سے آمدنی ہونے لگی' ایک تو مجاہد کی حیثیت سے کہ آپؐ جنگ میں شریک تھے اور جنگ میں شریک ہونے والوں کی طرح برابر حصہ ملتا جس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی۔ اس وقت ایسا نہیں تھا کہ مستقل ہر مہینے اور ہر سال آمدنی ہوتی رہتی ہو دوسرا وسیلہ اس مال غنیمت میں سرکاری مال تھا جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا تھا کہ جس طرح چاہیں آپؐ تقسیم فرمائیں۔ اگرچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا' بلکہ پبلک کی ضروریات کے لئے اور ملک کی عام بہبود' دفاعی انتظام' ہتھیاروں کی خریداری کے لئے خرچ ہوتا تھا۔ بہرحال اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے اور اگر کسی مکان میں کوئی چیز نہ ہوتی تو اس کو سرکاری مال یعنی خزانے کی چیزوں میں سے مہیا کر دی جاتی۔ جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے' اس کے بارے میں قرآن کا یہ حکم تھا کہ زکوٰۃ کا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال کے لئے حرام ہے۔ اگر سرکاری آمدنی حکمران کی آمدنی سمجھ لی جائے تو حکمران کے قریبی لوگ' ماتحت لوگ' ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر معلوم ہو کہ حکمران کے لئے یہ حرام ہے تو ماتحت افسران کو ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ حکمران ان کا محاسبہ کرے گا۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اہم بات ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی کسی اور قوم نے سرکاری آمدنی حکمران کی ذات کے لئے ممنوع قرار نہیں دی۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ اس عام حکم میں کہ جو مال دشمن کافروں سے' غیر مسلموں سے'

مال غنیمت کے طور پر حاصل ہو' اس کا ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ قل الانفال للہ و الرسول...." (1:8) کے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف مال غنیمت کے متعلق ہیں۔ "واعلموا انما غنمتم من شی" (41:8) اور مال غنیمت کا کچھ حصہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو اپنی ذات پر خرچ کر سکتے تھے۔ لیکن زکوۃ کا کوئی حصہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لئے صرف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک "الخمس مردود علیکم" کا تعلق ہے یہ مال غنیمت کے اس جزو 1/5 کا ذکر ہے جو حکومت کو آتا ہے۔ مال غنیمت کا 4/5 حصہ سپاہیوں میں تقسیم ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ بھی فوج کے دیگر سپاہیوں کی طرح اس 4/5 سے ملے گا اور وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت ہوگی اور اس پر گزر اوقات میں کوئی امر مانع نہیں۔ جو خمس حکومت کو ملتا ہے' اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت صدر مملکت کچھ اختیارات دیئے گئے ہیں اور عام زکوۃ کے برخلاف مال غنیمت سے حاصل ہونے والی آمدنی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اور اپنے خاندان کے لئے استعمال فرما سکتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بالکل ابتداء میں مدینہ میں' یہی صورت حال تھی' مکہ کا سوال نہیں کیونکہ یہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثتی جائیداد تھی' اپنی بیوی سے حاصل کردہ جائیداد تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تاجر تھے۔ مدینہ میں ہمیں یہ صورت نظر نہیں آتی' ہم دیکھتے ہیں کہ شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں مہمان رہے۔ اس کے بعد آپ کو ایسی چیزیں تحفتہ پیش کی گئیں جو مستقل تھیں۔ مثلاً کھجوروں کی فصل کے وقت اس کا کچھ حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا۔ اس کے بعد مال غنیمت ایک ذریعہ پیدا ہوا' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گزر بسر کے انتظامات میں آنے لگا۔ جنگ بدر کے بعد جلد ہی جنگ احد پیش آئی' (کم و بیش ایک سال بعد) اس موقعہ پر ہمارے مورخ ذکر کرتے ہیں کہ وہاں "مخیریق" نامی ایک یہودی تھا۔ کہتے ہیں کہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اپنی انتہائی عقیدت کے پیش نظر اس نے وصیت کی تھی کہ اگر جنگ میں مر جاؤں تو میرے سارے باغ جو مدینہ میں ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں گے۔ چنانچہ مخیریق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سات باغ تھے جن کی پوری

آمدنی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہو گئی۔ اس طرح ابتدائی زمانے کی دشواریاں ختم ہو گئیں۔ ہمیں اور چند چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔

خیرات ٹیکس بن گئی:۔ حکومت کی طرف سے ایک قانون بنا کہ سارے مالدار مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کریں۔ اس سلسلے میں ابتداء خیرات کا حکم دیا گیا' اور یہی خیرات بعد میں ٹیکس بن گئی۔ اس سلسلے میں مجھے مکرر ذکر کرنا پڑتا ہے کہ مال غنیمت کی آمدنی کا ایک حصہ حکومت کے لئے ہوتا تھا اور مال غنیمت کا 1/5 حصہ اور "مال فئے" پورا کا پورا حکومت کے تصرف میں آجاتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر دشمن سے لڑائی ہو اور جیسا کہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ گھوڑوں کے دوڑانے کے ذریعے دشمن کے علاقے پر دشمن کے مال پر قبضہ کیا گیا ہو' تو اسے مال غنیمت قرار دیا جاتا۔ اگر جنگ کے بغیر دشمن ماتحتی قبول کرلیتا اور یہ بھی قبول کرتا کہ ہم آزاد رہیں گے لیکن تمہیں اس قدر سالانہ خراج دیا کریں گے وغیرہ' ساری آمدنیاں " فئے " کہلاتی تھیں۔ ان کو تقسیم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سارے کا سارا سرکاری خزانے میں آجاتا۔ حکومت کی ان دو آمدنیوں کے ساتھ ساتھ اب ہم زکوٰۃ کو لیں گے جس کے اصول یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس اس کی ضرورتوں سے فالتو کچھ رقم ہو اور وہ رقم سال بھر اس کے قبضے میں بھی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ نہیں کہ مثلاً آج تو ہمارے پاس اپنی ضرورتوں سے فاضل ایک لاکھ روپے ہیں لیکن چھ دنوں' چھ مہینوں یا چند ہفتوں کے بعد وہ رقم ہماری ضرورتوں کے لئے خرچ ہو گئی۔ اسے فالتو رقم نہیں کہا جاسکتا۔ اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس معینہ نصاب کی رقم یعنی (Minimum) سے اونچی رقم کم از کم ایک سال تک موجود رہے تو اسے اس کا ڈھائی فی صد زکوٰۃ کے نام سے حکومت کو دینا ہو گا۔

اس میں کچھ تفصیلات کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ ساری زکوٰۃ ڈھائی فیصد نہیں ہے۔ مختلف چیزوں کی زکوٰۃ مختلف ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس روپیہ ہے یا سونا اور چاندی ہے ان پر ڈھائی فی صد سالانہ دینا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زراعت کرتا ہے تو فصل کٹنے کے بعد جو مقدار حکومت کے سپرد کی جاتی ہے اسے زکوٰۃ الارض کہتے ہیں۔ زکوٰۃ ہی کے نام سے اس چیز کو ہم موسوم کرتے ہیں جو آج کل مالگزاری کہلاتی ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے پاس لوہے کی کان ہو یا سونے

کی کان یا چاندی کی کان' اس سے بھی اس کو ایک حصہ حکومت کی خدمت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام کی شرطیں مختلف ہیں۔ اس طرح کسی کے پاس جانور ہوں مثلاً بکریاں' گائے' بیل' بھینس یا اونٹ وغیرہ تو ان کی بھی ایک تعداد معین تھی کہ اس سے زیادہ کسی کے پاس ہوں تو ہر سال اس کا اتنا حصہ حکومت کو دیا کرے گا۔ بکریوں کے متعلق ہم عام طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ایک فی صد لیا جاتا تھا۔ مثلاً کسی کے پاس پانچ سو بکریاں ہوں تو وہ پانچ بکریاں دیتا' کسی کے پاس دو سو بکریاں تو وہ دو بکریاں دیتا تھا۔ عام طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اونٹوں کی شرح اور گائے کی شرح اس سے کسی قدر زیادہ پیچیدہ ہے۔ مثلاً پانچ اونٹوں پر ایک بکری دیں یا دس اونٹوں پر فلاں دیں یا بیس اونٹوں پر ایک اونٹ دیں وغیرہ' بعض وقت ہمیں ایک اور ذریعہ آمدنی بھی نظر آتا ہے۔ وہ زکوۃ التجارہ ہے' یعنی تجارت کی زکوۃ اسی طرح زکوۃ المعدن یعنی معدنیات کی زکوۃ' غرض مختلف چیزوں پر جو ٹیکس مسلمان اپنی حکومت کو دیتے وہ سب زکوۃ ہی کے نام سے موسوم ہوتے اور ان کی تعداد مختلف ہوتی۔

نصاب زکوۃ:۔ یہ مسئلہ کم سے کم کتنی نقد رقم پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اس طرح سے پیچیدہ ہوگیا ہے کہ ہمارے فقہا کے نزدیک عہد نبوی میں دو سو درہم پر زکوۃ کی ادائیگی کا اطلاق شروع ہوتا تھا۔ دو سو درہم سے کم پر نہیں اور وہ اس معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ پرانے درہم آج کے کتنے روپے کے برابر ہوں گے۔ بدقسمتی سے اس کا تعین اس بنا پر ناممکن ہے کہ آئے دن (Devaluation) وغیرہ کی وجہ سے روپے کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے۔ اس کا جواب میں صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اپنے مقامی علماء سے آپ یہ سوال دریافت فرماتے رہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ آپ کو دھوکا نہیں دیں گے۔ آپ کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ بہرحال میں آپ سے اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں کہ رقم کی کم از کم مقدار جس پر زکوۃ واجب ہے اس کے متعلق اولاً یہ سوچنا چاہئے کہ عہد نبوی میں درہم کی قوت خرید کیا تھی؟ یعنی ایک درہم سے کتنا کام پورا ہو سکتا تھا اور اسی کی اساس پر ہم آج یہ دیکھیں کہ آج وہ غرض کتنے روپوں میں پوری ہوتی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ذکر آتا ہے کہ 8 ہجری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کی فتح کے بعد وہاں حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر فرمایا اور ان کی تیس (30) درہم ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ اسی تنخواہ میں گورنر' اس کی بیوی' اس کے بچے' اس کے گھر کے ملازم اور غلام وغیرہ سب گزارا کرتے تھے۔ میری رائے میں اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دو سو درہم کی جگہ آسانی کے ساتھ

ایسی شرح مقرر کی جا سکے جو (Inflation) کے باعث ہمیں مناسب نظر آئے فرض کیجئے کہ میں ایک درہم کو ایک روپے کے برابر تصور کر لوں تو آج کل کی گرانی میں دو سو روپے اتنی حقیر رقم ہے کہ وہ ہمارے ہاں کے چپڑاسی کو بھی ماہانہ دی جائے تو وہ قبول نہیں کرتا۔

اسلام سے پہلے کے مذہبوں میں سرکاری آمدنی کے ذرائع، یعنی کن کن چیزوں پر ٹیکس لیا جائے، اس کی تفصیل تو ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً توریت وغیرہ میں، لیکن کن کن مدات میں انہیں خرچ کیا جائے اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ وہ بالکل حکمران کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ اس ٹیکس کو وہ جیسا چاہے خرچ کرے اور عام طور پر حکمران اپنی ذات پر اور اپنی فضول خرچی وعیاشی پر خرچ کیا کرتے تھے۔ میرے علم میں قرآن کریم ہی وہ پہلی دینی کتاب ہے جس میں آمدنی کے وسائل کے متعلق بہت کم تفصیلیں ملتی ہیں، لیکن خرچ کے متعلق انتہائی تفصیل سے بتایا جاتا ہے کہ کس کو کتنی رقم دی جائے۔ مثلاً **"و تواحقہ یوم حصادہ"** (141:6) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر زکوٰۃ دینی چاہئے، لیکن صرف لفظ 'حق' ہے، یہ نہیں بتایا کہ کس مقدار میں، عشر (1/10) یا ڈھائی فی صد یا پچاس فیصد۔ ایسی تفصیلات قرآن میں نہیں ملتیں۔ یہ تفصیلیں ہمیں حدیث میں ملیں گی۔ لیکن قرآن کا یہ اصول نظر آتا ہے کہ آمدنی کے ذرائع کے متعلق زیادہ تفصیل نہ دے، بلکہ اگر میری توجیہہ (Interpretation) صحیح ہے تو قرآن اسے حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے کہ حسب ضرورت اس میں اضافہ و تخفیف کر سکے۔ جن چیزوں کا قرآن میں ذکر ہے (مثلاً زراعت پر ٹیکس، تجارت پر ٹیکس وغیرہ) ان کے علاوہ بھی کسی اور چیز پر ہم ٹیکس لے سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مقام پر مچھلیاں بہت ہوں یا کسی مقام پر شہد کی مکھیوں سے اگر تجارتی پیمانے پر آمدنی ہونے لگے تو ایک حصہ حکومت کو دیں۔ یہ ساری چیزیں زکوٰۃ بن جاتی ہیں۔

آج سے نہیں بلکہ ہزار سال سے زیادہ عرصے سے اسلامی حکومتیں یہ تجربہ کر چکی ہیں کہ ان کی آمدنیاں جو کہ زکوٰۃ و عشر سے حاصل ہوتی ہیں ان کی ضرورتوں کے لئے ناکافی ہیں تو اپنے زمانے کے فقہاء کے فتوے اور اجازت سے اور اتفاق رائے سے رعایا اور حکومت دونوں کی ضرورتوں کے پیش نظر نئے ٹیکس لگائے گئے اور ان کو "نوائب" کا نام دیا گیا جس کے معنی فوری ضرورتوں کے لئے عارضی ٹیکس کے ہیں۔ عارضی ٹیکس عملاً مستقل بن جاتے ہیں لیکن منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ مستقل ٹیکس مثلاً زکوٰۃ کی طرح کے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی حیثیت عارضی ہوگی۔ جب تک وہ ضرورت

باقی ہے اس پر عمل کیا جاتا رہے گا۔ تو (ان حالات میں) اگر ہماری ضرورتوں کے لئے زکوٰۃ اور عشر ناکافی ثابت ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ناکافی ثابت ہوں گے تو ان حالات میں "نوائب" کے نام سے مزید ٹیکس لگائے جاسکتے ہیں۔ جن میں پراپرٹی ٹیکس بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر ملک کی معمولی اور بنیادی ضرورتوں کو ہم پورا نہیں کرسکتے' چاہے وہ دفاع کی ضرورت ہو یا اور مماثل ضروریات' مگر اس کا فیصلہ میں نہیں کروں گا۔ حکومت کی وزارت مالیہ اور پارلیمینٹ کرسکے گی۔

یہاں میں یہ وضاحت پوری طرح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معینہ زمانہ میں' ایک معینہ شرح سے' ایک معینہ چیز پر' ہم رقم وصول کریں اور دینے سے انکار کرنے والے سے بالجبر وصول کریں تو اس لفظ کا پورا پورا اطلاق زکوٰۃ پر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی میں نے بیان کیا کہ زکوٰۃ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع میں زکوٰۃ ایک اختیاری چیز تھی یعنی خیرات کی طرح تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ قرآن مجید نے اس کو ایک فریضہ قرار دیا۔ اس کا زمانہ مقرر کیا۔ اس کی شرح مقرر کی اور اس کی ادائیگی پر مجبور کردیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بتاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا جائے تو تلوار کے ذریعے اسے وصول کیا جائے گا۔ یہی ٹیکس کے عناصر ہیں۔ ان حالات میں اگر زکوٰۃ کو ٹیکس کا نام دیا جائے تو وہ غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ ٹیکس ایک برا لفظ ہے۔ کسی کو ٹیکس کرنے کے معنی اس کو تکلیف دینے کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے ایک بہتر لفظ "زکوٰۃ" اختیار کیا ہے جس کے معنی ہیں "پاک کرنا" میرے مال میں خدا کے حکم کے مطابق لوگوں کا جو حصہ ہے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ صرف لفظ کا فرق ہے جبکہ معنی کی حد تک دونوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کی شرح میں تبدیلی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے فقہا کی یہ رائے ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی شرح کو نہ بدلا جائے اور عصری ضرورتوں کے لئے "نوائب" کے نام سے نئے ٹیکس لگائے جائیں تو اس طرح مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا قانون جو کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا نام ہے' اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کسی کو کوئی اختیار نہیں اور نہ ہی آج تک ایسی صورت پیش آئی ہے اور غالباً آئے گی بھی نہیں کہ ہماری حکومت یہ قرار دے کہ زکوٰۃ ایک گراں ٹیکس ہے اس کی ضرورت اب نہیں رہی' اسے اب کم کیا جائے۔ بلکہ اس کے برخلاف زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہماری حاجات ہوتی ہیں' لہٰذا "نوائب" کے نام سے مزید ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ ہاں ایک چیز کہی جاتی ہے کہ قیامت کے قریب

مسلمانوں میں دولت کی اس قدر فراوانی ہو جائے گی کہ لوگ مستحقین زکوٰۃ کی تلاش کریں گے لیکن انہیں کوئی ملے گا نہیں۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے جو ممکن ہے پوری ہو جائے۔ اس صورت میں زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کیونکہ کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔

مصارف زکوٰۃ:۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں صاف اور واضح قرآنی احکام ہیں' وہ مشہور و معروف آیت جو کہ سورۂ توبہ میں ہے۔ **انما الصدقات للفقراء و المساکین و العاملین علیہا و المو لفتہ قلو بھم و فی الرقاب و الغارمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل فریضتہ من اللہ....** " (60:9)

صدقات (یعنی حکومت کی آمدنیاں یا زکوٰۃ) کو تقسیم کیا جائے' فقراء پر' مساکین پر' اس کے بعد ذکر ہے۔ "والعاملین علیہا" کا' یعنی حکومت کے ان کارندوں پر جو تحصیل زکوٰۃ کے کام میں مشغول ہیں۔ عاملین کے بعد آکر آیا ہے' "والمولفتہ قلوبھم" یعنی ان لوگوں پر جن کے دل موہ لینے کی تمہیں ضرورت ہے (تبلیغ اسلام کے لئے) مثلاً جیسے آج کل ہم کہتے ہیں (Secret Service) حکومت مخفی طور پر ملت اور مملکت کے مفاد میں لوگوں پر کچھ رقم خرچ کرتی ہے اس کے بعد ایک لفظ ہے "وفی الرقاب" گردنوں کے چھڑانے کے لئے۔ اس کے معنی دو لئے جاتے ہیں۔ متفقہ طور پر ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے اور اسلامی مملکت کی مسلم اور غیر مسلم رعایا اگر دشمن کے ہاتھ میں قید ہو گئی ہو تو فدیہ دے کر انہیں رہائی دلانے کے لئے زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں اس کے بعد ایک لفظ ہے "غارمین" اس کے معنی یہ ہیں وہ کھاتے پیتے مال دار لوگ جن پر یکایک کسی حادثے یا خسارے سخت مالی بوجھ پڑ جاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے میں نے سہواً کسی آدمی کو قتل کر دیا۔ مجھے خون بہا دینے کی ضرورت ہے لیکن میں محتاج و معذور ہوں' تو حکومت کا فریضہ ہے کہ میری مدد کرے تاکہ میں اس فریضہ کی انجام دہی سے سبکدوش ہو سکوں۔ یہ ہے غارمین۔ اس کی مزید تشریح آگے آئے گی۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے۔ "فی سبیل اللہ" یعنی اللہ کی راہ میں' حیرت ہوتی ہے کہ فی سبیل کے اولین معنی ہیں دفاعی خدمات' ملک کی حفاظت کا انتظام اور فوج کے اخراجات۔ مسجدیں وغیرہ بنانے کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ اس کے بعد ایک اور لفظ ہے جس کی توقع عام حالات میں نہیں تھی مگر اس کا ذکر یہاں ملتا ہے۔ "ابن السبیل" اس کے لفظی معنی ہیں راستے کا بچہ اور مراد اس سے ہے مسافر۔ مسافر کسی مقام کا بھی ہو اگر ہمارے علاقے سے گزرتا ہے تو آج کل حکومتیں تو مسافر سے ٹیکس لیتی ہیں کہ ہمارے ملک میں کیوں آتے ہیں۔ اسلامی قانون کا حکم یہ ہے

کہ مسافروں کی مہمان نوازی کرو' انہیں کھلاؤ پلاؤ اور اقامت کی سہولتیں مہیا کرو۔ ان آٹھ مدات کے ذکر کے بعد قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ اللہ کا مقرر کردہ حکم ہے۔ "فریضتہ من اللہ دوسرے الفاظ میں حکومت کی (Budgeting) کی پالیسی متعین کردی گئی کہ ان آٹھ مدات میں زکوۃ کی آمدنی سے رقم صرف کی جائے۔ فقراء مساکین' عاملین علیہا' مولفتہ القلوب فی الرقاب' غارمین' فی سبیل' ابن السبیل' اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی دلچسپ چیز کا میں ذکر کرتا ہوں۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ چونکہ آٹھ مدات میں رقم خرچ کرنے کا حکم ہے' لہٰذا آمدنی کا 1/8 حصہ ہر ایک کو دلایا جائے۔ دوسرے آئمہ کی رائے یہ نہیں ہے۔ ابتدائی دو نام فقراء اور مساکین سے کیا مراد ہے؟ بظاہر دونوں مترادف لفظ ہیں مگر اس میں اختلاف رائے رہا ہے اور اس اختلاف رائے کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوا تھا تو امام شافعی نے کہا۔ چونکہ اللہ نے آٹھ مدوں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور ان نے اپنے وفور رحمت سے غریبوں کو دگنا حصہ دلانا چاہا' اس لئے دو نام استعمال کئے گئے ہیں۔ 1/8 کے 2/8 یا ایک چوتھائی آمدنی ان لوگوں کے لئے خرچ کی جائے۔ یہ محض علمی بحث کے سلسلے میں میں نے آپ سے بیان کیا ہے۔

غیر مسلموں کی اعانت:۔ ایک چیز بہت زیادہ اہم ہے۔ آج کل اگر ہم اپنی فقہ کی کتابوں کو کھولیں تو ان میں نظر آئے گا کہ زکوۃ صرف مسلمانوں کو دی جا سکتی ہے غیر مسلموں کو نہیں دی جاسکتی۔ ہمیں نظر آتا ہے کہ انتہائی ابتدائی زمانہ اسلام میں' انتہائی مقدس اور قابل احترام ہستیوں کی یہ رائے نہیں تھی۔ چنانچہ امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی تالیف "کتاب الخراج" میں اگر ہم دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں زکوۃ کی آمدنی سے یہودیوں کی بھی مدد فرماتے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک روز وہ مدینہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے' دیکھا کہ ایک شخص بھیک مانگ رہا ہے۔ انہیں حیرت ہوئی کہ میرے زمانے میں لوگ بھیک مانگیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حکومت کا فریضہ ہے کہ غریبوں کی مدد کرے' انہیں کھلائے پلائے۔ اس سے پوچھتے ہیں تو کون ہے؟ وہ کہتا' میں ایک یہودی ہوں۔ اب تک کاروبار کیا کرتا تھا' اور جزیہ دیا کرتا تھا۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں' کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مجبور ہوں کہ بھیک مانگوں' تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے حد متاثر ہوئے اور فوراً اپنے افسر خزانہ کو حکم دیا کہ اس یہودی کے لئے روزینہ مقرر کردیا جائے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ "ہذا من مساکین اہل الکتاب" یہ مساکین کی مد میں آتا ہے

اس لئے زکوٰۃ سے اس کو رقم دی جائے۔ دوسرے معنی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے اور بعض دیگر صحابہ مثلاً حضرت زید بن ثابت' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ کی رائے کا ذکر طبری نے کیا ہے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو دی جا سکتی ہے' اور وہ کہتے ہیں کہ "فقراء" سے مراد مسلمانوں کے فقیر اور مساکین سے غیر مسلم رعیت کے فقیر ہوں گے۔ جو بھی ہو یہ پہلی مد ہے۔

انتظامیہ:۔ والعاملین علیہا تیسری مد ہے۔ اگر میں یہ توجیہہ کروں کہ اس سے مراد پوری سول ایڈمنسٹریشن ہے تو حیرت کی بات نہ ہوگی۔ کیونکہ زکوٰۃ کو جمع کرنے والے' زکوٰۃ کا حساب رکھنے والے' زکوٰۃ کے حساب کی جانچ پڑتال یا آڈیٹنگ (Auditing) کرنے والے' زکوٰۃ کو تقسیم کرنے والے تقسیم کی نگرانی کرنے والے یہ سب عاملین میں آجاتے ہیں چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری سول ایڈمنسٹریشن یعنی سرکاری ملازمین کی تنخواہ زکوٰۃ کی آمدنی سے دی جائے گی۔

تالیف قلب:۔ اس کے بعد ہے "**مولفتہ قلوبھم**" اس سلسلہ میں ایک بہت ہی مشہور کتاب ہے' ابو العلیٰ الفراء الحنبلی' جیسے کٹر قسم کے عالم کی۔ کٹر کا لفظ میں اچھے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں کہ وہ کسی ذاتی غرض یا کسی سیاسی ضرورت کے تحت دبنے والے انسان نہیں تھے۔ کھری کھری بات سناتے تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے۔ "الاحکام السلطانیہ" یہ ماوردی کے معاصر ہیں اور ماوردی کی کتاب ہی کے نام سے یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے۔ اس میں زکوٰۃ کی مدات پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "مئولفتہ قلوبہم" یعنی جن لوگوں کا دل موہ لینا ہے ان کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لئے دی جائے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لئے دی جائے کہ وہ مسلمانوں کو مضرت پہنچانے سے باز رہیں۔ عام حالات میں وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر ان کو رقم دے دیں تو مثلاً جنگ کے زمانے میں وہ غیر جانبدار رہیں گے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تیسری قسم' ابو العلیٰ الفراء لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ چوتھی قسم وہ کہتے ہیں' ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لئے دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے قریبی رشتہ دار' ان کے قبیلے کے لوگ' ان کے خاندان کے لوگ اسلام قبول کریں۔ اس فہرست کے بعد وہ ایک جملے کا اضافہ کرتے ہیں کہ یہ رقم مسلمان اور غیر مسلم کسی کو بھی دی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے

کہ کسی کی تالیف قلب کرنی ہو یا کسی کو' مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچانے کے لئے رقم دی جانی ہو' تو وہ غیر مسلم ہی ہو گا۔ لیکن وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ چاہے وہ غیر مسلم ہو یا مسلم' اس کو مولفہ قلوبہم کے تحت زکوٰۃ کی آمدنی سے رقم دی جاسکتی ہے۔

اس سے آگے چلئے "فی الرقاب" یعنی ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے حکومت امداد کرے۔ ملک کی رعایا کو' دشمن کی قید سے چھڑانے کے لئے حکومت زکوٰۃ صرف کرے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد آرہا ہے۔ "طبقات ابن سعد" میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کچھ تفصیلی حالات دے کر ان کا خط نقل کیا گیا ہے۔ وہ خط انہوں نے گورنر یمن کے نام لکھا ہے۔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ جتنی رعایا دشمن کے ہاتھ قید ہو' اس کو چھڑانے کے لئے سرکاری خزانے سے رقم خرچ کی جائے' اس صراحت کے ساتھ کہ چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی' تو گویا رقاب کے سلسلے میں اسلامی رعیت کو دشمن کی قید سے رہائی دلانے کے لئے جو فدیہ دیا جاتا ہے اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح فقراء اور مساکین کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے میں زکوٰۃ کی رقم سے غیر مسلم کی مدد کی جاسکتی ہے۔ مؤلفہ قلوبہم کے سلسلے میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں' اسی طرح رقاب کے سلسلے میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ زکوٰۃ بظاہر غیر مسلموں پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

بلا سود قرضے:۔ "غارمین" کا لفظ جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا کسی شخص پر رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں غیر معمولی بوجھ پڑ جائے اور وہ اس سے عہدہ بر آنہ ہو سکے۔ ہمارے مؤلف مثالیں دیتے ہیں کہ مثلاً اس کا مال راستے میں چوری ہو گیا یا اس کا مال کسی طغیانی میں' کسی زلزلے میں یکایک ضائع ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ ایسی حالتوں میں اس بظاہر مالدار شخص کی بھی ہم مدد کرسکتے ہیں کیونکہ وہ اچانک' عارضی طور پر محتاج ہو گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بظاہر اس لفظ غارمین سے استنباط کرکے ایک نئی چیز کا ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور وہ سرکاری خزانے سے لوگوں کو امداد نہیں بلکہ قرض دینا ہے۔ کوئی شخص کھاتا پیتا ہے اس کو امداد کی ضرورت نہیں لیکن اس کو مال کی ضرورت ہے' مثلاً تجارت کے لئے یا کسی اور کام کے لئے' تو حکومت اس کو قرض دیتی ہے اور قرض ظاہر ہے کہ بلا سود ہی ہو گا کیونکہ حکومت ہی وہ ادارہ ہے جو سود کی آمدنی کا خیال کئے بغیر' رعایا ہی کی آمدنی رعایا کو قرض دے سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا

طرز عمل یہی نظر آتا ہے وقتاً" فوقتاً" وہ لوگوں کو سرکاری خزانے سے بلا سود قرضے دیتے۔ اس سے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کم تھی' ان کی تنخواہ کم تھی کبھی کبھی انہیں ضرورت پیش آتی تھی تو وہ سرکاری خزانے سے قرض لیتے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ماہ تنخواہیں نہیں بٹتی تھیں بلکہ چھ ماہ میں ایک بار یا سال میں دو مرتبہ' تو اپنی تنخواہ کے ملنے پر وہ ادائیگی کر دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح اور لوگوں کو بھی اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ لفظ "غارمین" سے یہ بھی استنباط کیا گیا تھا۔

دفاعی انتظامات:۔ "فی سبیل اللہ" کے متعلق ابھی میں نے ایک حد تک اشارہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد فوجی انتظام اور دفاع کا انتظام ہے۔ سول ایڈمنسٹریشن کا ذکر ہم "عاملین علیہا" کے تحت دیکھ چکے ہیں۔ "فی سبیل اللہ" کے تحت پوری ملٹری ایڈمنسٹریشن آ جاتی ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی' اسلحہ کی فراہمی اور دیگر فوجی ضروریات سب اس مد کے تحت آ جاتی ہیں۔ نیز اور چیزیں بھی مثلاً مسجدوں کا بنانا' کارواں سرائے تعمیر کرنا' مدرسوں کی تعمیر وغیرہ یہ ساری چیزیں فی سبیل اللہ کے تحت' اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے تحت آ جاتی ہیں۔

فروغ سیاحت:۔ آخری چیز "ابن السبیل" راستے کا بچہ یعنی مسافر جو گزر رہے ہیں' اس کی طرف بھی میں نے اشارہ کیا اور میں گمان کرتا ہوں کہ اس میں بھی مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ کوئی غیر مسلم کسی مقام سے گزرے' مثلاً وہاں سب مسلمان ہوں' تو اس کی مہمان نوازی اور اس کی ضرورتوں کا انتظام کرنا یہ حکومت کے فرائض میں داخل تھا اور میں اس کو اور بھی زیادہ توسیع دے کر کہہ سکتا ہوں کہ ابن السبیل کے معنی پورے (Tourist Traffic) کا انتظام ہے۔ اس میں سڑکوں کا بنانا' پلوں کی تعمیر' اس میں پولیس کا انتظام کرنا کہ گزرنے والوں کی جان و مال محفوظ رہے۔ اسی طرح بازاروں کی نگرانی کہ وہاں پر دغا اور فریب نہ ہو' غذا صحت کے لئے مضر نہ ہو وغیرہ وغیرہ ابن السبیل کے لفظ کے تحت آ جائیں گے۔ یہ ایک تاثر ہے جو اس آیت کے پڑھنے سے اور اس آیت کے متعلق ہمارے پرانے مفسرین کی آراء کو معلوم کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں اور اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں کہ آج کل ہمارے فقہا یہ رائے نہیں رکھیں گے اور وہ کہیں گے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو نہیں دی جا سکتی' انہیں اختیار ہے' لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ' یہودیوں اور عیسائیوں کی زکوٰۃ کی مد سے

امداد کیا کرتے تھے۔ ایک یہودی کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے کہ "کتاب الخراج" کے مطابق مدینہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا بلاذری نے لکھا ہے کہ شام کے سفر کے دوران حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ کی مد سے غریب اور محتاج عیسائیوں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔

موجودہ تصور کا آغاز:۔ سوال اس وقت یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا جو تصور آج کل ہمارے ذہنوں میں ہے کہ ہر شخص اپنی بچت سے سال کے اختتام پر ڈھائی فی صد رقم غریبوں کو بطور زکوٰۃ دیا کرے' یہ تصور کب سے پیدا ہوا ہے' جب کہ عہد نبوی میں زکوٰۃ حکومت وصول کرتی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مرتدین سے جو جنگ ہوئی وہ اسی زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں تھی۔ لوگ زکوٰۃ حکومت کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مجبور کیا کہ انہیں زکوٰۃ حکومت ہی کو ادا کرنی ہوگی۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیسے پیدا ہوا؟ تاریخ کی کتابوں میں اس کی وجہ بیان کی گئی ہے جس کا تعلق حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں' ستائیس ہجری کا میں معین طور پر ذکر کرتا ہوں کہ اسلامی فوجیں ایک طرف یورپ' "اندلس اور افرنجا" میں پہنچ گئی تھیں (افرنجا سے مراد غالباً فرانس ہوگا۔ اندلس اور افرنجا کے الفاظ طبری نے بیان کئے ہیں) دوسری طرف ستائیس ہجری میں مسلمانوں کی فوجیں دریائے جیحوں کو عبور کرکے ماوراء النہر تک پہنچ جاتی ہیں یعنی چین کی سرحد تک گویا اسلامی حکومت' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد تین براعظموں' یورپ' افریقہ اور ایشیاء میں پھیل جاتی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی' آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی فتوحات نئی نئی ہوتی تھیں۔ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ لوگ راتوں رات سچے مسلمان ہوجائیں گے۔ میرا اپنا گمان ہے کہ اس وقت ایک سو مربع میل میں ایک سے زائد مسلمان نہیں ہوتا ہوگا' ان حالات میں میرا یہ اندازہ ہے۔ (میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں) کہ اگر اس زمانے میں زکوٰۃ کی وصولی کے لئے ہر ایک مسلمان کے مکان پر کارندے جاتے' اس سے اس کا حساب مانگتے کہ تمہیں کتنی آمدنی ہوئی' کتنا خرچ ہوا' کتنی رقم سال بھر باقی رہی' تو تین براعظموں میں اس کام کے لئے کثیر عملے کی ضرورت ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ مصارف زیادہ ہوتے اور آمدنی اس سے کم ہوتی۔ ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وزیر فنانس نے مشورہ دیا ہوگا کہ اس رقم کو مسلمانوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔

انہیں معلوم ہے کہ زکوٰۃ دینا فرض ہے' اللہ کا فرض کیا ہوا امر ہے' اس لئے ان لوگوں کے ضمیر پر چھوڑ دیجئے' ان سے کہہ دیا جائے کہ ہر سال زکوٰۃ کی رقم خود ہی قرآنی احکام کے مطابق تقسیم کرلیا کریں' اگر حکومت اس کے انتظام بدستور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تو سرکاری عملے کے اخراجات اتنے بڑھ جاتے کہ اس بار گراں کو کوئی عقل مند وزیر فنانس قبول نہ کرسکتا بہرحال ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ کے زمانے میں یہ طے کیا گیا کہ زراعت کی زکوٰۃ' معدنیات کی زکوٰۃ سونا اور فلاں چیز کی زکوٰۃ تو بدستور حکومت ہی لے گی لیکن نقد رقم کی زکوٰۃ' سونا اور چاندی' درہم اور دینار' اس کو مسلمان اپنی ہی ذاتی صوابدید پر' اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق ہر سال تقسیم کردیا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم بھول گئے کہ زکوٰۃ کے معنی عہد نبوی میں اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دو خلفاء کے دور میں کیا تھے۔ اب ہم اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی خیرات ہے کہ ہر سال اپنی آمدنی سے اور اپنی بچت سے غریبوں کے لئے کرتے ہیں۔ حالانکہ صرف غریبوں کا ہی اس میں حق نہیں بلکہ اور مدات بھی اس کے اندر شامل ہیں۔

خراج۔ اب میں اس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ مسلمانوں سے تو یہ سلوک ہو رہا ہے' پھر غیر مسلم رعایا سے کیا کیا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ اولاً مثلاً زراعت ہے' زراعت کے سلسلے میں ابتدائی دور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کسی علاقے کو فتح کیا جاتا تو ایک معاہدے کے ذریعے یہ صراحت کی جاتی کہ اس علاقے کے لوگ کتنی رقم حکومت کو سالانہ پیش کریں گے اور پھر اس کے لئے ایک خصوصی انتظام کیا جاتا اور اس علاقے میں حکومت کا ایک نمائندہ یا نائب ہوتا جو مقامی رعایا سے رقم وصول کرکے' حکومت کو سالانہ مجموعی رقم ادا کردیا کرتا۔ اس کو خراج کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ خراج زراعتی اراضی کے لئے بھی ہوتا' دیگر چیزوں کے لئے بھی ہوتا۔ اس طرح غیر مسلم رعایا سے جزیہ بھی لیا جاتا جس کا قرآن حکیم نے بھی حکم دیا ہے جو اولاً قرآنی احکام کے تحت صرف اہل کتاب یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے متعلق خیال کیا گیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں پہلے اس میں مجوسیوں یا پارسیوں کو شامل کیا گیا' حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بربر جو شمالی افریقہ میں رہنے والی ایک بت پرست قوم تھی' ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ پھر جلد ہی جب سندھ فتح ہوا تو ہندو اور بدھ مت لوگوں کو جو وہاں پائے جاتے تھے' اسی زمرے میں شامل کرلیا گیا اور

وہ بھی جزیہ دینے لگے۔ اس طرح غیر مسلم رعایا سے بھی ٹیکس لئے جاتے تھے۔ بعض اور صورتوں میں مسلمانوں کے ٹیکس سے کسی قدر گراں تر شرح سے' مثلاً کہتے ہیں کہ اگر مسلمان تاجر کسی مقام پر سامان لاتے تو ان سے ڈھائی فی صد شرح کے حساب سے چنگی وصول کی جاتی تھی' اگر وہ ذمی ہوتے تو ان سے پانچ فی صد شرح سے' اگر غیر ملکی اور غیر مسلم ہوتے تو ان سے دس فی صد۔ غرض شرح بدلتی رہتی تھی۔ ذکر آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مدینہ میں گرانی بڑھنے لگی تو انہوں نے غیر ملکی غیر مسلم تاجروں سے امپورٹ ڈیوٹی بجائے دس فیصد کے پانچ فی صد کردی تاکہ سامان کے نرخ میں تخفیف ہو اور لوگوں کو گرانی کی جگہ ارزانی میسر ہو۔ اس طرح چند اصول تھے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کی صورت میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو زکوٰۃ سونے اور چاندی کے متعلق ہے اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس بارے میں صراحت ملتی ہے کہ یہ مسلمانوں پر واجب ہے لیکن غیر مسلموں پر نہیں۔ غیر مسلموں سے ٹیکس اور خراج کے نام سے زراعت وغیرہ کی زکوٰۃ تو لی جاتی ہے۔ لیکن سونے' چاندی' درہم اور دینار پر ان سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔ اس کی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ غیر مسلموں کو اس حکومت کے اندر داخلی خود مختاری دیدی گئی تھی' مسلمانوں کے علاوہ جتنی رعایا تھی مثلاً یہودی' نصرانی اور پارسی وغیرہ' ہر ایک کمیونٹی کو اپنے قومی و مذہبی معاملات میں آزادی حاصل تھی۔ ان انتظامات کے لئے بھی کچھ رقم کی ضرورت ہونی چاہیے۔ لہٰذا غیر مسلم رعایا پر جو سونے اور چاندی کی رقم پر زکوٰۃ ہونی چاہئے تھی اس کو ان اقلیتوں کی مذہبی انتظامیہ کے لئے مخصوص کردیا گیا جو ان سے اپنا ٹیکس وصول کرتی اور اس کے ذریعے اپنی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں سے چنگی کی شرح میں تفاوت بظاہر موخر الذکر پر ظلم لگتا ہے۔ اس سوال کا جواب میں نے ایک یہودی النسل اطالوی پروفیسر "لیوی ویل لویدا" کو دیا تھا جو یہودی النسل تھے۔ وہ اعتراض پر تلے ہوئے تھے لیکن جب میں نے تشریح کی تو وہ ایک دم چپ ہو گئے اور کہا کہ اس منطق کے سامنے کسی کی زبان بھی نہ کھل سکے گی۔ میرا جواب یہ تھا کہ مسلمانوں پر بعض بندشیں ہیں جو غیر مسلموں پر نہیں۔ انہیں سب سے اہم سہولت سود کی ہے جب کہ ایک مسلمان نہ سود لے سکتا ہے نہ دے سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی قانون غیر مسلموں کو داخلی خود مختاری عطا کرتا ہے جس میں ان کا حق ہے کہ وہ سود لیں یا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک سود لینے

والا غیر مسلم تاجر بہت جلد متمول ہو جاتا ہے بہ نسبت ایک مسلمان تاجر کے۔ اس کی سالانہ آمدنی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ٹیکس بھی اسی شرح سے عائد ہوتا ہے۔ اسے ظلم نہیں کہا جا سکتا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس ٹیکس کی شرح کی زیادتی کے باوجود غیر مسلم زیادہ فائدے میں رہتا ہے' اس لحاظ سے بھی کہ اسلامی حکومت مسلمان پر زیادہ مالی ذمہ داریاں اور پابندیاں عائد کرتی ہے بہ نسبت غیر مسلموں کے۔

تقویم:- اس ضمن میں تقویم کا مسئلہ دلچسپ ہے اور اس پر ہمارے مولفین آج کل کم غور کرتے ہیں۔ عرب میں اسلام سے پہلے آج کل کی طرح شمسی سال پایا جاتا تھا۔ جس طرح انگریزی سنہ کی وجہ سے سال کے موسم معین مہینوں میں آتے ہیں۔ لیکن اس کا نظام الگ تھا۔ مہینوں کا آغاز رویت ہلال سے ہوتا تھا اور مہینوں کا اختتام نئے رویت ہلال سے ہوتا تھا' یعنی خالص قمری مہینے پائے جاتے تھے۔ لیکن چونکہ قمری سال کے بارہ مہینوں میں چھ مہینے انتیس اور چھ مہینے تیس ہوتے تھے۔ اگر ہم شمار کریں تو ایک سال میں دنوں کی مجموعی تعداد تقریباً 354 دن بنتی ہے۔ موسموں کا جو فرق پیدا ہوتا ہے کبھی گرمی' کبھی سردی وغیرہ' یہ آفتاب کی گردش کے باعث ہے۔ آفتاب کی گردش 365 یا 366 دنوں میں مکمل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے قدیم زمانے میں بابل والوں نے جب یہ معلوم کر لیا کہ قمری سال چھوٹا ہوتا ہے کوئی گیارہ بارہ دن بہ نسبت شمسی سال کے' تو انہوں نے شمسی تقویم اختیار کر لی۔ مدینہ والوں نے دیکھا کہ اگر قمری سال پر عمل کریں تو فصل کاٹنے کا زمانہ' حکومت کو ٹیکس دینے کا زمانہ اور بیجوں کو بونے کا زمانہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے' انہوں نے اس کا ایک حل معلوم کر لیا۔ وہ یہ تھا کہ تقریباً ہر تین سال کے بعد ایک مرتبہ بجائے بارہ کے تیرہ مہینوں کا سال کر دیا جائے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو اس طرح تین سال میں تینتیس دن ہوں گے جو تقریباً ایک مہینے کے برابر ہیں تو موٹے حساب سے ہر تین سال کے بعد ایک مہینے کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ کیلنڈر میں اس سال تیرہ مہینے ہوتے اور پھر اس کے بعد دو سال بارہ بارہ ماہ ہوتے۔ پھر تیسرا سال تیرہ مہینوں کا ہوتا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد تجربے نے ثابت کر دیا کہ یہ حساب ٹھیک نہیں۔ اپنے علم کی ترقی سے انہوں نے تحقیقات کے ذریعے اس نظام کو اور زیادہ ترقی دی اور کہا کہ اتنے سال کے بعد یعنی تین برس کے بعد ایک مہینے کا اضافہ ہو گا' وغیرہ۔ اس طرح وہ اس بات میں کامیاب ہو چکے تھے کہ

زراعتی اغراض کے لئے قمری مہینوں کے ذریعے سے بھی شمسی مہینوں کی طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ شہر مکہ میں بھی یہ نظام پایا جاتا تھا۔ اس کو زمانہ جاہلیت میں "نسئ" کا نام دیا گیا۔ میں اس کی تفصیلات بتانے سے گریز کروں گا۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ "نسئ" جس میں کبھی کبھی ایک تیرھواں مہینہ پڑ جاتا تھا' اس کا رواج رہا۔ مکہ میں حج کے باعث پورے جزیرہ نمائے عرب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی' آخری تین مہینوں کے سوا اسی نظام کے تحت بسر ہوئی۔ آخری تین مہینوں کی ترکیب اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے خطبے میں "نسئ" کی منسوخی کا قرآنی حکم کے تحت اعلان فرمایا: "انما النسی زیادۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما" لیواطوا عدۃ ماحرم اللہ فیحلوا ماحرم اللہ۔۔" (37:9) غرض اس کی منسوخی رسول اللہ علیہ وسلم کے وصال کے صرف تین مہینے پہلے اور ذی الحجہ کے مہینے میں عمل میں آئی۔

ترمیم کے نتائج:- اس اصلاح یا مخالفین اسلام کے الفاظ میں' اس نافہمی کی ترمیم کی وجہ سے کیا نتائج نکلے' اسے دیکھنا پڑے گا۔ نافہمی کا لفظ وہ اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ دوبارہ خالص قمری نظام رائج ہو جانے کی وجہ سے حکومت کو ٹیکسیشن میں دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً انہوں نے طے کیا تھا کہ رمضان کے مہینے ہر سال لوگ مالگذاری ادا کریں گے۔ پہلے ایک سال تو رمضان کے مہینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ فرق پیدا ہوتا گیا اور پھر یہ ہوا کہ رمضان آجاتا تھا اور فصلیں کٹتی نہیں تھیں' کھیتیاں کھڑی رہتی تھیں وغیرہ۔ اس سے یہ تصور کر لیا گیا کہ اس بنا پر یہ اصلاح نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے تخریب تھی' لیکن عہد نبویؐ کا رواج ہمیں اس کا جواب دے دیتا ہے کہ یہ ایسا نہیں تھا۔ اگرچہ نسی کی منسوخی کا اعلان ذی الحجہ 10ھ میں کیا گیا' لیکن غالباً اس کی پیش بندی میں کچھ عرصہ پہلے سے ہی ایک اور انتظام قائم کر دیا گیا تھا' جس کے اشارات ہمیں پوری وضاحت کے ساتھ مختلف مکتوبات نبویؐ میں ملتے ہیں۔ مختلف قبیلوں کے سرداروں کو پروانے دیئے جاتے ہیں' ان سے معاہدے ہوتے ہیں یا ان کو کوئی جاگیر وغیرہ دی جاتی ہے تو اس میں صراحت ہے کہ یہ لوگ زکواۃ معین مہینے میں یعنی رمضان شوال وغیرہ میں نہیں دیں گے بلکہ فصل کٹنے پر ادا کریں گے۔ سب سے بڑی دشواری قمری سال میں یہی ہے کہ زراعتی اغراض کے لئے کار آمد نہیں ہے۔ اس کا حل رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ زراعتی اغراض

کے لئے لوگ اپنا ٹیکس یا مالگذاری قمری مہینے کے لحاظ سے ادا نہیں کریں گے بلکہ فصل کے کٹنے پر۔ لہٰذا ساری دشواریوں کا اس طرح خاتمہ ہو جاتا ہے۔ باقی جو دوسرے ٹیکس ادا کرنے ہوتے ہیں' مثلاً تجارت پر یا معدنیات پر اس میں اسی ترمیم کی وجہ سے' اس نظام کی تبدیلی کی وجہ سے اور شمسی سال کی جگہ قمری سال کو نافذ کرنے کی وجہ سے' حکومت کو ایک غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ جرمنی میں ایک لیکچر دیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اگر اس مصلحت کو آج روسی اور امریکی وزرائے مالیات معلوم کریں تو دونوں ہی قمری سنہ کو اختیار کر لیں گے اور شمسی سنہ کو رد کر دیں گے۔ اس کی وجہ میں نے یہ بتائی کہ چونکہ شمسی سال سے قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا ہر تیس سال میں شمسی لحاظ سے تو حکومت تیس مرتبہ ٹیکس وصول کرے گی' لیکن قمری سال کے حساب سے اکتیس مرتبہ ٹیکس لے گی۔ حکومت کو ہر تیس سال میں ایک زائد سال کے ٹیکس وصول ہو گی۔ کونسا وزیر مالیات ہو گا جو اس زائد آمدنی کو قبول نہ کرے گا۔ تقویم کی اس تبدیلی کی وجہ سے اس میں شک نہیں کہ قانون میں ایک طرح کی لامرکزیت Decentralisation پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض چیزوں پر ایک زمانے میں ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور بعض چیزوں پر کسی دوسرے زمانے میں۔ یہ کوئی مصیبت کی چیز نہیں تھی بلکہ ایک اور نقطہ نظر سے جانچیں تو حکومت کے لئے بھلائی کی چیز تھی۔ معلوم نہیں آپ لوگوں کو واقفیت ہے کہ نہیں کہ آج کل حکومت کا خزانہ ٹیکس ادا ہونے سے عین پہلے خالی ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی فوری ضرورتوں' ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ کے لئے رقم نہیں ملتی' تو وہ Debenture کے ذریعے سود پر قرض لیتی ہے۔ جب ٹیکس کی وصولی کے باعث خزانہ بھر جاتا ہے تو پھر وہ قرضے ادا کر دیتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ شمسی سال کے تحت سارے ٹیکس ایک معین مہینے میں آتے ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ یا زراعت کا ٹیکس ہے۔ فرض کیجئے وہ اگست کے مہینے میں ہمیشہ آئے گا۔ دیگر ٹیکسوں میں کچھ تو روزانہ کے ہیں اور کچھ نقدی وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کا خزانہ ایک خاص زمانے میں خالی ہو جاتا ہے تو حکومت کے پاس روز مرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے مطلوبہ رقم نہیں ہوتی۔ اسلامی حکومت میں اس نظام کے تحت یعنی اصلاح کے تحت حکومت کے ٹیکس مختلف موقعوں پر وصول ہوتے ہیں۔ جو زراعتی ٹیکس ہے۔ اس کا مہینہ الگ ہوتا ہے' دیگر ٹیکسوں کا زمانہ علیحدہ ہوتا ہے اور معدنیات' سونا اور چاندی وغیرہ کا زمانہ الگ مقرر ہوتا ہے۔ اس طرح حکومت کا خزانہ ہر زمانے میں بھرا رہتا ہے

اور رہ سکتا ہے۔ یہ بات شمسی سال میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ایک خاص پہلو تھا' جس کی طرف مجھے اشارہ کرنا تھا۔

شاید آخری جملے کے طور پر یہ عرض کروں کہ سارے اسلامی ممالک میں موجودہ شمسی تقویم یعنی انگریزی نظام چل رہا ہے۔ اس نظام میں باوجود علم کی ترقی کے اور انتہائی دقیق آلات کی ایجاد اب بھی رفتہ رفتہ فرق پیدا ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار سال کے بعد پورے ایک دن کا فرق پیدا ہو جائے گا۔ عمر خیام نے بھی اپنے زمانے میں ایک نظام پیش کیا تھا۔ میں نے اس کا جو مقالہ پڑھا تھا' اگرچہ میں اس کی تفاصیل سمجھنے سے قاصر رہا' البتہ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک دن کا فرق ایک لاکھ سال کے بعد پیدا ہو گا۔ اس کا نظام زیادہ پیچیدہ ہے لیکن اتنا صحیح ہے کہ پورے ایک لاکھ سال میں بھی مشکل سے ایک دن کا فرق پیدا ہوتا ہے۔

استدراک:- قمری تقویم کے سلسلے میں بعض مزید اعتراضات معاشی حوالوں سے بھی کئے جاتے ہیں اور دینی تقریبات کے حوالے سے بھی۔ کہا جاتا ہے اس سے پیشگی منصوبہ بندی میں مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح عیدین وغیرہ کے سلسلے میں بھی ہم آہنگی مفقود ہو جاتی ہے۔ ان دونوں امور کے متعلق میں الگ الگ معروضات پیش کرتا ہوں۔

قمری تقویم ہو یا شمسی تقویم اگر آپ منصوبہ بندی کئی سال پہلے کرتے ہیں تو کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قمری سال کے اگر 354 دن ہوتے ہیں' تو اس سال محرم کا مہینہ خواہ انتیس کا ہوا ہے یا تیس کا' صرف ایک دن کا فرق ہو گا اور پانچ سال میں جو فرق ہو گا وہ مشکل سے ایک یا دو دن کا ہو سکتا ہے۔ اس سے ہماری منصوبہ بندی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ ہم یہی کہیں گے کہ پانچ سال کی آمدنی سے ہم پانچ سال تک آئندہ فلاں فلاں طریقے سے کام کریں گے۔ مجھے اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ دوسرے میں یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ خود عہد نبویؐ کے رواج کے مطابق ہم شمسی سال کو بھی استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قبائل کو حکم دیا کہ تم سے زکواۃ معین مہینے میں نہیں لی جائے گی بلکہ فصل کٹنے پر وصول کی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں شمسی سال پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ منصوبہ بندی کے لئے بھی اگر ہم شمسی سال پر عمل کریں' مثلاً عمر خیام کے سال پر تو کوئی امر مانع نہیں۔ اسلام اس سے نہیں روکتا۔ جہاں تک عیدین کا تعلق ہے' میں اپنی حد تک اسے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ پاکستان میں جمعرات کو عید منائی

جائے اور بنگال میں جمعہ کے دن یا چہار شنبہ کے دن۔ کیونکہ اصل سوال یہ ہے کہ آیا میں اپنے خدا اور اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو پورے خلوص' پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا ہوں یا نہیں۔ اہمیت اس کو نہیں ہے کہ میں کس دن اس فریضہ کو انجام دیتا ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بنگال میں اور پاکستان میں اوقات میں شاید ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ مغرب کی نماز آپ یہاں جس وقت پڑھتے ہیں وہاں تقریباً عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اب بھی ہم اس شمسی یا قمری سال کے بغیر بھی اختلاف رکھتے ہیں اور یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں یہ چیز پیش آ چکی ہے کہ اسلامی خلافت کے ایک ملک میں' چاند ایک دن دیکھا گیا اور دوسرے دن دوسرے علاقوں میں۔ چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے' سنن ابو داؤد میں ذکر آتا ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک شخص امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لئے یا کسی اور غرض سے' دمشق بھیجا گیا۔ وہ وہاں رمضان کا پورا مہینہ مقیم رہا' پھر اس نے بیان کیا کہ ہم دمشق میں ایک دن پہلے چاند دیکھ چکے ہیں اور آج اتیسویں نہیں تیسویں ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے گفتگو کے دوران یہ بات کہی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی حکم دیا ہے کہ مقامی رویت کے مطابق عمل کریں۔ چاہے دوسرے مقام کی رویت خود خلیفہ وقت کے حکم سے ہی کیوں نہ عمل میں آئی ہو۔ ان حالات میں اگر ہم آج قانون فطرت کے مطابق رویت ہلال دو مختلف اوقات میں کرتے ہیں' تو میرے نزدیک اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ ایک دن عید منائیں' لیکن عید منائیں اور نماز بھی پڑھیں' دوسرا شخص دوسرے دن عید منائے لیکن وہ بھی نماز کو اہمیت دے "دن" کو نہیں۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے اس لئے میرے نزدیک یکسانیت پیدا کرنے پر اصرار کرنا محض بے کار ہے۔

باب 3

نظام تشریع و عدلیہ

یہ مضمون دو ایسے پہلوؤں سے متعلق ہے' جن میں بے شمار باتیں تشریح طلب ہیں۔ اس میں دو اجزا پر خصوصی توجہ دینا پڑے گی۔ ایک "قانون سازی" اور دوسرے "عدلیہ" جس کی غرض کے لئے قانون سازی ہو گی۔

قانون سازی:- جہاں تک تشریع یعنی قانون سازی کا تعلق ہے' دو تمہیدی باتیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ رسم و رواج کی صورت میں کوئی قاعدہ چلا آ رہا ہو' اور ہمیں بالکل معلوم نہ ہو کہ اس کا بنانے والا کون تھا؟ وہ کتنے عرصے سے چلا آ رہا ہے؟ اور اس کی تاریخ کیا رہی ہے؟ دوسری قسم قانون کی وہ ہوتی ہے جسے معلوم المولف اور معلوم المصنف کہہ لیں۔ یعنی اس کے بنانے والے کا ہمیں پتا ہوتا ہے' مثلاً کوئی بادشاہ' کوئی حکمران جو ایک قاعدہ اپنے ماتحت لوگوں کے لئے مقرر کرتا ہے اور وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کبھی اسے ایک انسان پیش کرتا ہے' لیکن یہ کہتے ہوئے کہ یہ میرا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ خدا کے احکام ہیں۔ مگر ان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسم و رواج کے متعلق ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قانون کیسے بنا؟ ممکن ہے اس کا کوئی جزو تو ایسا ہو' جو خدائی احکام کے طور پر' کسی پیغمبر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہو' ہم فراموش کر گئے ہوں' وہ عمل ہماری عادت بن گیا ہو اور نتیجتہ" اس عمل کو ہم نے جاری رکھا ہو۔ قانون اصل میں دو طرح کے ہیں ایک خالص انسانی قانون اور دوسرا خدائی قانون۔ ایک تمہیدی مگر اہم بات یہ ہے کہ قانون بن جانے کے بعد اس کو ایک مماثل درجے کا اقتدار رکھنے والی' مماثل درجے کی شخصیت ہی بدل سکتی ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنی جماعت کے اندر ایک حکم دے تو کوئی

طالب علم یا دفتر کا کوئی ادنیٰ ملازم اس کو بدل نہیں سکتا البتہ وائس چانسلر اسے بدل سکتا ہے یا وائس چانسلر سے بھی بڑی شخصیت' وزیر تعلیم یا ملک کا حکمران اسے بدل سکتا ہے' لیکن بنانے والے سے کمتر نہیں بدل سکتا۔ اس کے اثرات بہت دور رس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی قانون اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہو تو اس کو بدلنے والا اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ خدا سے کم تر رتبے کا کوئی فرد اس کو بدلنے کا اختیار نہیں رکھتا' بجز اس کے کہ وہ ملحد ہو' اللہ کو نہ مانتا ہو۔ اس کے بعد پیغمبر اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی قانون بنا سکتا ہے' اسے وحی نہ آئی ہو' وہ اپنی قابلیت اور ملکہ سے حکم دیتا ہے تو اب اس قانون کو کوئی پیغمبر ہی بدل سکتا ہے۔ پیغمبر سے کم تر درجے کی کوئی شخصیت مثلاً کوئی بادشاہ' کوئی مجتہد' کوئی فقیہ اس کو بدلنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ البتہ اللہ کی ذات پیغمبر کے حکم کو بدل یا منسوخ کر سکتی ہے۔ یعنی قانون بدلنے کا بھی ایک معیار ہے۔ مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر توریت میں کوئی حکم ہو تو انجیل یا قرآن مجید سے اسے بدل سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی اللہ کے احکام کا مجموعہ ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقوال کو' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال کو' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے بدل سکتے ہیں اور ان پیغمبروں کے احکام کو یا تو اللہ کی ذات بدلے گی یا کوئی اور پیغمبر ہی بدل سکے گا۔

اساسی ماخذ:- اسی پس منظر میں اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی قانون کس طرح بنتا ہے؟ جہاں تک اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے تو عہد نبوی" ہم جانتے ہیں کہ غار حرا میں پہلی وحی سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تیئیس سال کے عرصے پر مشتمل رہا' اور یہ کہ اسلام کا اساسی ماخذ قانون یعنی قرآن مجید ایک دم نازل نہیں ہوا۔ وہ کتابی صورت میں یا تختیوں پر لکھے ہوئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانون کی طرح ہم تک نہیں پہنچا بلکہ تیئیس (23) سال کے عرصے میں وقتاً" فوقتاً" نازل ہونے والی آیات کی صورت میں امت تک پہنچایا گیا۔ ان حالات میں بہت ہی سادہ اور بدیہی بات ہے کہ غار حرا میں جس وقت پہلی وحی یعنی سورۃ اقراء کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ اس وقت اسلامی قانون موجود نہیں تھا۔ قرآن مجید یا حدیث میں جو حکام آئے وہ بہت بعد میں آئے۔ اسلام کی ابتدا میں اسلامی قانون کیا تھا؟ قرآنی اشارات کی بناء پر اور تاریخ عہد نبوت' کی روشنی میں ہم پورے ادب کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں' کہ شہر مکہ کے جو بھی رسم و رواج تھے' وحی کی غیر موجودگی میں وہی مسلمانوں کا قانون تھا اور وہ اس پر عمل کرتے رہے۔ مثلاً شراب کی

ممانعت ہجرت کے کوئی سال بعد نازل ہوئی۔ ان آیات کی شان نزول یہ ہے کہ ایک دن ایک صحابی نے شراب پی لی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں تھے کہ نماز پڑھائی تو وہ سورہ قل یایہا الکافرون کی آیات اس طرح پڑھ ڈالیں۔ جس سے معنی الٹ گئے اور جو چیز ناممکن تھی وہ ان کی زبان سے نکل گئی تو اس سلسلے میں قرآن مجید کی وہ آیات نازل ہوئیں' جن میں شریب پینے کو حرام قرار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حکم آنے تک شراب کا پینا جائز تھا' واجب نہیں۔ لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شراب نہیں پی' لیکن کچھ صحابہ اس سے سیراب ہوتے رہے۔ یہی حال اور سارے احکام کا ہے۔ پہلی وحی میں اگرچہ بت پرستی کی ممانعت کی گئی تھی لیکن اور احکام و ممانعات کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ممنوعات کی عقل بھی متقاضی ہے۔ مثلاً چوری نہیں کرنی چاہیے' کسی بے قصور کو جان سے نہیں مارنا چاہیے کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے۔ انسانی فطرت اور انسانی عقل بھی ان کو نامناسب سمجھتی ہے۔ ان کی ممانعت تو جاری رہ سکتی ہے' لیکن جن چیزوں کے متعلق انسانی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے' مثلاً شراب کا پینا' سور کا گوشت کھانا' ان پر اگر اہل مکہ عمل کرتے رہے ہوں اور اس کی ممانعت ابھی تک نہ آئی ہو تو مسلمانوں کے لئے اس پر عمل کرنا' جائز قرار دیا جائے گا۔ وہ اسلامی قانون ہی ہوگا' اگرچہ عارضی قابل تبدیلی قانون' لیکن بہرحال اسلامی قانون ہی ہوگا۔

دوسرا ماخذ:- اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہیں اور وہ ایک محدود مدت کے لئے ہوتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کا وجود ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے ساتھ ان کا دوام' ان کی عمر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ہمارے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے بعد' ان میں تبدیلی غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ مختصر گنجائش میں یہ تو ممکن نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بتائے کہ قرآن و حدیث میں کون سا قانون پہلے آیا' پھر تیئس سال کے عرصے میں اس میں کیا تبدیلی آئی۔ لیکن مجموعی طور پر ہم یہ پیش نظر رکھیں گے کہ قرآن مجید کے ذریعے سے جو احکام آئے' وہ خدائی حکم کے طور پر ہمارے پاس آئے اور اس میں تبدیلی اور تو اور خود پیغمبر بھی اپنی ذاتی رائے سے نہیں کر سکتا۔ اس طرح سنت کے ذریعے جو احکام ہم تک پہنچتے رہے' ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ وحی و الہام کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے ہیں اور اس شرط یا اس صراحت کے ساتھ کہ انہیں قرآن میں داخل نہ کیا

جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے "**وما ینطق عن الھوی○ ان ھو الا وحی یوحی**○" (4,3:53) (پیغمبر جو چیز بھی بیان کرتا ہے وہ اپنی ذاتی خواہش کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ خدا ہی کی وحی ہوتی ہے۔ جو اس تک پہنچائی جاتی ہے) تو اگر پیغمبر کی بیان کردہ چیزیں قرآن میں داخل نہ کی گئی ہوں تو مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ وہ الہام کے ذریعے پیغمبر تک پہنچی ہوں گی اور پیغمبر نے پوری دیانت سے ہم تک پہنچائی ہوں گی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مسئلے میں احکام کی ضرورت ہو' قرآن میں وہ احکام ہمیں نہ ملتے ہوں اور وحی کا انتظار ہو' وحی آتی نہیں ان حالات میں اگر معاملہ ایسا ہے کہ جس میں انتظار کیا جا سکتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ لیہ وسلم انتظار کرتے ہیں۔ لیکن معاملہ فوری فوری ہو تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اجتہاد و استنباط کر کے' استدلال کر کے' اپنے صوابدید سے کوئی حکم دیں۔ ایسے حکم کی دو صورتیں ہوں گی یا تو خدا اس کی توثیق کر دے گا یا خدا اس کو نامناسب سمجھے تو تبدیلی کا حکم دے گا۔ اس بارے میں ایک معقول تصور یہ بھی ہے کہ اگر خدا کو رسول کا استنباط نامناسب نہ معلوم ہو تو توثیق حکومت کے ذریعے سے بھی ہو سکتی ہے اور وحی کے ذریعے سے بھی۔ یہ فوری بھی ہو سکتا ہے اور اس میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ترمیم کا کوئی حکم نہ آئے تو چاہے کتنی ہی مدت گزر جائے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے مجاز ہوں گے کہ اس پر عمل کرتے رہیں کیونکہ اس کی تبدیلی کا خدا نے حکم نہیں دیا۔ پیغمبر کے استدلال و استنباط میں تبدیلی کے لئے خدا کا حکم آنا ضروری ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے' اس بارے میں کوئی صریحی حکم اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لے کر ان کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تو فوراً ہی خدا کی طرف سے وہ مشہور آیت تنبیہہ نازل ہوئی: "**لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذ تم عذاب عظیم**" (68:8) (اگر اللہ اس سے پہلے ہی فیصلہ نہ ہوتا تو اس چیز کو جو تم نے حاصل کی ہے یعنی مال فدیہ' اس کی بنا پر تمہیں سخت عذاب دیا جاتا) یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ یہ بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ رسول کا انسانی حیثیت میں استنباط اسے پسند نہیں آیا۔ البتہ اس خاص صورت میں' جو میں بیان کر رہا ہوں' اس کے متعلق خدا یہ وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ میں پہلے ہی سے اس کا حکم متعین کر چکا تھا' لہٰذا اب میں اسے قبول کرتا ہوں' اس کی توثیق کرتا ہوں' تم اس پر عمل کر سکتے ہو۔ ایسی دوسری مثالیں بھی ہیں۔ رسول کریمؐ کے استنباط کردہ حکم کی قرآن کے ذریعے سے' وحی

کے ذریعے سے فوراً تمنیخ ہو گئی۔ ایسی تمنیخ کی بنا پر اس کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ غرض جہاں تک اسلامی قانون کے بنیادی اساسی ماخذوں کا تعلق ہے' پہلی چیز ملک کا رسم و رواج ہے جو معقولیت کے منافی نہ ہو اور جس میں اس وقت تک قرآن و سنت کے ذریعے سے تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ دوسرا ماخذ قانون تاریخی نقطہ نظر سے ہو گا۔ وضع کردہ قانون یعنی صراحت کے ساتھ کسی قاعدے کا مقرر کرنا اور یہ قرآن کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہے' سنت کے ذریعے سے بھی۔ ان دونوں میں ایک اساسی فرق ہے کہ قرآن اللہ کا حکم سمجھا جائے گا اور سنت کے سلسلے میں مختلف وجوہ سے اس کا درجہ قرآن سے کمتر ہو گا۔ اگر پیغمبر کی زندگی میں' پیغمبر ہی سے ہم کوئی حکم سنیں تو اس کا درجہ قرآن کے بالکل برابر ہو گا۔ مثلاً اگر عہد نبویؐ میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو کوئی شخص یہ کہتا کہ یہ قرآن ہے' اللہ تعالیٰ کا حکم' میں اس کی تعمیل کرتا ہوں اور یہ آپ کا انسانی حکم ہے' میں اس کی تعمیل نہیں کرتا۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو فوراً ہی ملت سے خارج کر دیا جاتا۔ بعض وجوہات سے حدیث کی حیثیت کچھ کم ہو جاتی۔ قرآن کی تدوین' یعنی ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا انتظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں کرایا اور اس کے ایک ایک حرف کو اپنے حکم کے ذریعے امت تک پہنچایا۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو صحابہ نے اپنی ذاتی صوابدید سے لکھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہ کی انفرادی قابلیتوں کے اختلاف کے باعث ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور دوسرا صحابی کسی نہ کسی وجہ سے' مثلاً یہ کہ وہ عالم و فاضل نہیں ہے یا یہ کہ وہ ان پڑھ ہے' بدوی ہے یا صرف چھینک لینے سے اس نے کوئی لفظ نہیں سنا اور اس ایک بنیادی اہم لفظ کے نہ سننے سے اس حدیث کے صحیح روایت نہ ہو گی۔ چنانچہ قرآن کی تدوین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں تیار کی ہوئی دستاویزات سے کرائی اور حدیث' جو صحابہ نے ذاتی صلاحیتوں سے انفرادی طور پر مرتب کی' دونوں میں فرق ہو گا۔ اس لئے بعد کے زمانے میں کسی حدیث پر عمل کرنے کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آیا یہ ابتدائی حکم ہے یا آخر تک یہی قانون رہا۔ شروع میں ایک حکم دینے کے بعد اسے منسوخ تو نہیں کر دیا؟ آیا یہ حکم کسی مخصوص شخص کے لئے تھا یا وہ سارے لوگوں کے لئے ہے؟ اس حدیث کو صحابی نے صحیح طور پر سنا اور صحیح طور پر لکھا یا ان کی انفرادی صلاحیتوں کی وجہ سے اس میں کچھ فرق بھی پیدا ہو گیا ہے؟ صحابہ کے بعد تابعین کی روایات سے مختلف زمانوں میں

مجموعہ حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑا؟ انہی وجوہ سے حدیث کا درجہ قرآن کریم سے کم تر ضرور ہے لیکن اس کا جو اصل اصول ہے وہ میں بیان کرچکا ہوں کہ رسول کے حکم کو صرف رسول سے کمتر درجے کی شخصیت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی تبدیلی کرے۔ ضمناً" میں یہ بھی عرض کروں کہ حدیثوں کی صحت معلوم کرنے کے لئے بہت سے وسائل ہیں۔ ہمارے اسلاف نے بہت سے اصول مدون و مرتب کرکے، ہمیں حدیثوں کے جانچنے کا معیار دیا ہے کہ کون سی حدیث قابل اعتماد ہے؟ اگر دو حدیثوں میں اختلاف ہے تو کس کو ترجیح دی جائے؟ واضح رہے کہ میرا یہ منشا ہرگز نہیں کہ حدیثوں پر اعتماد نہ کیا جائے۔ کیونکہ "صحاح ستہ" جیسی کتابوں کے متعلق ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ان کی تدوین، انسانی حد تک، صحت کے تمام اصول و شرائط کے مطابق ہوئی ہے۔ لہٰذا حدیث کی کم ترین درجے کی کتاب کو بھی میں پورے اعتماد کے ساتھ دوسری قوموں کی مستند ترین کتابوں پر ترجیح دوں گا۔ مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے۔ انجیل جو آج کل چار انجیلوں کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے، اس کے متعلق خود عیسائی مورخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے تین سو سال بعد پہلی مرتبہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ ان تین صدیوں میں نسلاً "بعد نسلاً" اس کو کس طرح نقل کیا گیا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک کس طرح پہنچایا گیا؟ اس کا قطعاً ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب میں ایک ایک سطر والی حدیث کے متعلق بھی پوری تفصیل سے حوالے (References) ملتے ہیں۔ فلاں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے، اس طرح حوالوں کا یہ سلسلہ بالا خر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لہٰذا اتنے حوالوں کی موجودگی میں ادنیٰ ترین حدیث کی کتاب دوسری قوموں کی کامل ترین کتابوں کے مقابلے میں بلند درجہ رکھتی ہے۔

درجات احکام:- احکام کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سارے احکام یکساں درجے کا حکم نہیں رکھتے۔ بعض کی حیثیت فرض یا واجب کی ہوگی، بعض کا حکم سفارش اور مستحب کا ہوگا۔ بعض کی صورت حرام کی ہوگی، یعنی ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ بعض کی ممانعت ایسی ہوگی کہ نہ کرو تو بہتر ہے، وہ مکروہ سمجھے جائیں گے اور بہت سی چیزوں کے متعلق یہ حیثیت ہوگی کہ وہ ہماری صوابدید پر چھوڑی گئی ہیں یعنی مباح ہیں، چاہے تو کریں، چاہے نہ کریں۔ مگر یہ تصور کسی قدر دیر سے پیدا ہوا کہ علمی نقطہ نظر سے احکام کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جائے اور یہ تقسیم اخلاقی اساس پر ہوگی۔ جو

چیز خیر ہے' اچھی ہے' بہتر ہے اسے ضرور کرنا چاہیے۔ جو چیز شر ہے' بدی ہے' اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ جس چیز میں خیر غالب ہے لیکن اس میں شر کا بھی ایک عنصر پایا جاتا ہے' اس کا کرنا بہتر ہے' لیکن واجب نہیں ہو گا۔ اس کے برخلاف جس میں شر کا غلبہ ہے' اگرچہ خیر کا بھی کچھ عنصر پایا جاتا ہے' اس کا نہ کرنا بہتر ہے' اسے مکروہ کہا جائے گا اور جن چیزوں میں یہ صورت نہیں ہے' نہ خیر ہے نہ شر ہے یا دونوں برابر ہیں' اس کو ہم مباح قرار دیں گے۔ یہ پنج گانہ تقسیم غالباً دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی اور جیسا کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے' یہ معتزلہ اصول فقہ کی کتابوں میں ہمیں پہلی مرتبہ ملتی ہے۔ اس سلسلے میں (Digression) کے طور پر ایک چھوٹی سی بات عرض کروں گا کہ بھلائی اور برائی کے لئے قرآن میں دو اصطلات آئی ہیں جو دلچسپ ہیں اور شاید ضرورت ہے کہ اس کی تھوڑی سی تحلیل بھی کی جائے۔ اچھی چیز کو قرآن "معروف" کہتا ہے اور بری چیز کو" منکر" کہتا ہے' "امر بالمعروف نہی عن المنکر"۔ کہیں کہیں "خیر" اور "شر" کا لفظ بھی آیا ہے۔ لیکن عام طور پر خیر کی جگہ "معروف" کا لفظ اور "شر" کی جگہ "منکر" کا لفظ مستعمل ہے "معروف" کے لفظی معنی ہیں "وہ چیز جو سب لوگ جانتے ہوں" اور "منکر"۔ "وہ چیز جو بالکل نہیں جانی جاتی"۔ بہت دنوں تک میں سوچتا رہا کہ وہ چیز جو بالکل نہیں جانی جاتی' ایک غیر معروف چیز' یہ اصطلاح اس معنی کے لئے کیوں استعمال ہوئی؟ بالآخر یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ خدا انسانوں کو بطور ان کے قانون ساز' بطور ان کے مالک و خالق کے' جو چاہے حکم دے سکتا ہے' اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن خدا حکیم ہے اس لئے وہ کسی بری چیز کا حکم نہیں دے سکتا۔ ہر وہ چیز جو معقول ہے' جسے عقل انسانی قبول کرتی ہے اور ہر شخص اس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ اچھی ہے' اسی کا حکم دیا جائے گا اور جس چیز کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بری ہے' اسے ممنوع قرار دیا جائے گا۔

ابدی اور عارضی قوانین:- عہد نبویؐ میں کچھ اور بھی ماخذ قانون ملتے ہیں۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے میں عرض کروں گا کہ قرآن مجید اور حدیث ابدی ماخذ قانون ہیں۔ چونکہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا سابقہ قانون یعنی قرآنی قانون ہی قیامت تک نافذ رہے گا' اسی طرح پیغمبر کے حکم کو منسوخ کرنے کے لئے جس پیغمبر کی ضرورت ہو گی اس کے نہ آنے کی بنا پر حدیث و سنت بھی ابدی بن جائیں گے اور قیامت تک ان پر عمل کرنا ہمارے لئے واجب ہو جائے گا۔ کتاب و سنت میں بعض چیزیں مستحب ہیں' بعض چیزیں

حرام ہیں اور بعض مکروہ ہیں۔ محض امر کا صیغہ استعمال کرنے سے وہ ایک درجے میں نہیں پہنچ جاتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں زکواۃ دینے کا حکم ہے' جو فرض ہے اور قرآن میں اسی صیغے کے ذریعے حکم آئے گا کہ خیرات کرو' ظاہر ہے کہ یہ فرض نہیں بلکہ اس کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

عہد نبویؐ ہی میں اور قوانین بھی ہمیں ملتے ہیں جو موقت یا عارضی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو ہم "معاہدہ" کا نام دیتے ہیں اور اس معاہدے میں کچھ شرطیں قبول کرتے ہیں' تو وہ شرطیں مسلمانوں کے لئے واجب التعمیل ہوں گی لیکن اس وقت تک کہ وہ معاہدہ برقرار رہے۔ جیسے ہی وہ معاہدہ ختم ہو جائے یا وہ منسوخ کر دیا جائے تو وہ شرطیں اور ہمارے قانون کے وہ اجزا بھی منسوخ ہو جاتے ہیں اسی طرح معاہدے کے ذریعے قبول کی ہوئی شرطوں کو اسلامی قانون کا عارضی اور وقتی جز سمجھا جائے گا۔ اگرچہ اس کی تعمیل اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنی ان احکام کی جوابدہی کے طور پر قیامت تک کے لئے قرآن و حدیث میں دیئے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط منظور فرمائی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مشرکین مکہ کے ہاں پناہ گزین ہو جائے تو اس کا مسلمانوں کے سپرد یا تحویل کیا جانا ضروری نہیں ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر مشرکین کا کوئی شخص مسلمان ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پناہ کے لئے آتا ہے تو اس معاہدے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ قرار دے دیا گیا تھا کہ اس شخص کو مکے والوں کے مطالبے پر واپس کر دیں۔ یہ اگرچہ یک طرفہ کارروائی تھی لیکن جب تک وہ معاہدہ برقرار رہا' وہ قاعدہ اسلامی قانون کا جز رہا۔ جیسے ہی وہ معاہدہ دو سال بعد ختم ہو گیا' ان حالات میں وہ قانون بھی' وہ شرطیں بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔

ایک اور بات یہ ہے کہ بعض وقت نیا قانون بنانے کی جگہ اسلامی حکومت اس چیز کو قبول کر لیتی ہے کہ کسی اجنبی ملک کے ساتھ اسی قاعدے پر عمل کرے جو قاعدہ اس ملک میں رائج ہے۔ اس ضمن میں جو مثال اس وقت میرے ذہن میں ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی ہے' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بمشکل تین چار سال بعد کا واقعہ ہے۔ شام میں بازنطائن کی شمالی سرحد پر ممدج نامی ایک مقام تھا۔ وہاں کے مسلمان والی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھ بھیجا کہ سرحد پار کے لوگ ہمارے یہاں تجارت کے لئے آنا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ چنگی سے متعلق کیا برتاؤ کیا جائے' کس شرح اور کس مقدار سے ان سے چنگی لی جائے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب بھیجا کہ ان تاجروں سے اسی شرح سے چنگی لو جس شرح سے ان کے ملک میں مسلمان تاجروں سے لی جاتی ہے۔ اس قاعدے کی مزید تشریح و توضیح کرتے ہوئے امام محمد شیبانی، جو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد رشید تھے، اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قاعدے کا اطلاق مختلف طور پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً اجنبی ملک میں مسلمان تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لی جاتی تو ہم بھی اس ملک کے تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لیں گے۔ مماثلت کا فائدہ اپنی جگہ برقرار رہے گا، جب تک ہماری حکومت اس کے خلاف فیصلہ صادر نہ کرے۔

اجتہاد:- اس کے بعد قابل ذکر بات، اسلامی قانون سازی کو ایک ایسا وسیلہ عطا کرنے کے متعلق ہے کہ وہ قیامت تک زندہ رہ سکے۔ یہ اجتہاد ہے۔ ہمارے فقہا جو چار اصول بیان کرتے ہیں: قرآن، حدیث، اجماع، اور قیاس، ان میں اجماع عہد نبویؐ میں نہیں پایا جاتا۔ قیاس جس کو ہم اجتہاد کا نام دے رہے ہیں، وہ عہد نبویؐ میں ہی وجود میں آ چکا تھا، اور یہ عہد نبویؐ کے آخری زمانے کا واقعہ ہے ہجری یعنی وفات سے سال ڈیڑھ سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حکم دیا تھا اور جن حالات میں وہ حکم دیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے میں ایک صحابی کو قاضی بنا کر روانہ کیا۔ ان کا نام معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر مامور کر دیا جائے تو جانے سے پہلے آخری باریابی، آخری ملاقات کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور حضورؐ اسے آخری ہدایت دیتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا "فیما تحکم" (تم حکم کس اساس پر دیا کرو گے) ان کا جواب تھا "بکتاب اللہ" (اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مطابق) قرآن میں جو احکام ہوں گے، ان کا نفاذ کروں گا، ان کی تعمیل کراؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فان لم تجد" (اگر اس میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟) تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً کہا: "فبسنۃ رسول اللہ" اس صورت کو بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا لیکن پھر فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو کیا کرو گے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ تھے "**اجتہد برای ولا ال جھدا**" "(میں اپنے رائے کے ذریعے سے کوشش کروں گا نیا حل تلاش کرنے کی، اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا)" دوسرے الفاظ میں اپنی صوابدید سے غور کر کے، استدلال کر کے، استنباط کر کے، قیاس کر کے حکم

دوں گا اور ایسی چیز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا جو میری دانست میں اللہ کو پسند ہو' معقول ہو اور عدل و انصاف کے مطابق ہو۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوش ہوئے کہ ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف کہتے ہیں: اے اللہ تو نے اپنے رسولؐ کو جس چیز کی ہدایت دی ہے۔ اس پر تیرا رسول خوش ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں سکوت کی صورت میں یا اس میں قانون نہ ملنے کی صورت میں ہمیں اجتہاد کی اجازت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار بہت ہی محدود ہے۔ اگر قرآن و حدیث میں صراحت موجود ہے تو اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی وقت اجتہاد کر سکیں گے جب کہ قرآن و حدیث میں باوجود تلاش کے کوئی قاعدہ' کوئی حکم پیش نظر مسئلے سے متعلق نہ ملتا ہو۔

استدلال' استحسان' استصلاح:- اجتہاد کے ذریعے سے قانون دریافت کرنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ خاص اس چیز کے لئے تو حکم نہیں ہے لیکن ایک مماثل چیز کے لئے حکم ہے۔ فرض کیجئے کہ چوری کا قانون موجود ہے لیکن کفن چوری کا ذکر قرآن میں نہیں ہے کہ کیا کریں؟ تو ہمارا مجتہد قیاس کرے گا۔ چونکہ ایک قسم کی چوری کے لئے حکم ہے تو ایک دوسری قسم کی چوری میں بھی ہم اسی قسم کا استدلال کر سکتے ہیں یا اس میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ حکم دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اور مسائل کے متعلق بھی بعض وقت مماثلتیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر تو منطقی استدلال کے ذریعے ہم ایک چیز کا حکم دے سکتے ہیں' لیکن اگر ذرا غور کریں تو فوری طور پر ذہن میں آنے والا طریقہ مناسب نہیں ہوتا بلکہ ایک عمیق تر وجہ سے کوئی دوسرا ہی قانون مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کو استحسان کہتے ہیں کیونکہ ایک عمیق تر وجہ کے باعث ہم ایک دوسرے طریقے یا قانون کو بہتر اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ کبھی ایک اور اصول پیش نظر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس کا فائدہ اس میں ہے۔ بہت ہی سخت قسم کی منطق سے تو یہ فائدہ ہونا چاہیے۔ لیکن امت کی فلاح' امت کی بہبود اور آسانی کے لئے یہ دوسرا قاعدہ بہتر معلوم ہوتا ہے اس لئے استصلاح کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف لطیف فرق کے ساتھ اجتہاد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کا رواج ہمیں عہد نبویؐ سے ملنے لگتا ہے۔ اس قاعدے کے اطلاق کے باعث' خاص طور پر قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں ہمیں ایک نئی چیز سے سابقہ پڑتا ہے' جو قانون سازی کا ایک جز ہے۔ فرض کیجئے کہ قرآن و حدیث میں کوئی قاعدہ نہیں ملتا اور قاضی اجتہاد کر کے ایک ایک حکم دیتا ہے۔ چونکہ وہ قاضی ہے' اس لئے وہ اپنے فیصلے کا نفاذ بھی کرا سکتا ہے' رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ لیکن ممکن ہے کہ نفاذ سے پہلے خود قاضی کو شبہ ہو۔ وہ مرکز سے دریافت کرے گا۔ مرکز سے جواب دیا جائے گا جو سنت ہونے کے باعث وضع قانون کی صورت اختیار کرے گا' اس کا تعلق اجتہاد سے نہیں رہے گا۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قاضی نے فیصلہ کر دیا اور اس سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی ذریعے سے اطلاع پہنچی یا یہ کہ فریق مقدمہ نے اپیل کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نامہ نگاروں کے ذریعے سے اطلاع پائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس فیصلے کو نامناسب سمجھتے ہیں تو فوراً اس گورنر یا قاضی کو ہدایت کی جائے گی کہ یوں نہیں یوں کرو۔ ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف گورنروں کو ہدایتیں بھیجیں کہ یوں نہیں یوں کیا کرو۔ ایک مثال ہے کہ ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل خطا کے طور پر تھا اور اس کا خون بہا دلایا گیا۔ پرانے رواج کے مطابق خون بہا متوفی کے سب وارثوں کو نہیں بلکہ صرف مرد وارثوں کو دلایا گیا اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ ہدایت بھیجتے ہیں کہ فلاں شخص کے خوں بہا میں سے اس کی بیوہ کو بھی حصہ دلایا جائے۔ خون کو وراثت قرار دیا گیا۔ وراثت کی صورت میں بیوی کے' بیٹے کے' بیٹی کے' ماں باپ کے یعنی ہر ایک کے قرآن میں حصے مقرر کئے جا چکے ہیں۔ اسی طرح خون بہا میں بھی اسی تناسب کا لحاظ رکھنا ہو گا۔ مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قانون سازی کس طرح اس زمانے میں عمل میں آیا کرتی تھیں۔

اجماع:۔ اجماع کا قاعدہ عہد نبویؐ میں ناممکن تھا' وہ بعد کی چیز ہے۔ اجماع کے معنی ہوتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں اگر ہمیں کسی مسئلے کا حل نہیں ملتا تو ہم اس بارے میں قیاس و اجتہاد سے کام لیتے ہیں اور اس اجتہاد پر اس زمانے کے سارے ہی علماء متفق ہو جاتے ہیں۔ ایسے قانون کو جس پر سب علما متفق ہو جائیں' لازماً زیادہ قابل قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ اجماع کو ہم ایک خاص اہمیت ضرور دیتے ہیں لیکن کم از کم حنفی فقہا کے نزدیک اجماع اٹل اور ناقابل تبدیل نہیں ہے' بلکہ ایک جدید تر اجماع کے ذریعے ایک قدیم تر اجماع کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ایک نبی کے احکام کو دوسرا نبی منسوخ کر سکتا ہے' اسی طرح ایک فقیہ کی رائے کو دوسرا فقیہ رد کر کے اپنی علیحدہ رائے دے سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک قدیم اجماع کو بدل کر دوسرا جدید اجماع قائم ہو جائے تو وہ پہلے اجماع ہی کی طرح واجب التعمیل ہو جائے گا اور پرانا اجماع باقی نہیں رہے گا۔ یہ رائے خاص امام ابو

یوسف البردوی کی ہے۔ اصول فقہ پر ان کی مشہور کتاب میں ان کے الفاظ یہی ہیں کہ جدید تر اجماع کے ذریعے سے قدیم تر اجماع منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلامی قانون کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ چونکہ یہ قانون خدا اور رسول کی طرف سے آیا ہوا اٹل قانون نہیں ہے' اس لئے اس کے ہمیشہ کے لئے پابند نہ ہو جائیں' بدلنے والے حالات کے تحت' بدلنے والی ضرورتوں کے تحت' ہم ایک انسان کے قانون کو دوسرے انسان کے ذریعے بدل سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہم یہی کہیں گے کہ اجماع کے خلاف زبان کھولنے کی جرات نہیں کی جا سکتی لیکن اس قاعدے کے تحت جو امام بزدوی نے بیان کیا ہے' اولا" کسی نہ کسی کو پرانے اجماع کے خلاف زبان کھولنی پڑے گی اور پرانی رائے پر اعتراض کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر بعد میں معاصر فقہا اس کی رائے کو قبول کرتے جائیں گے جب سارے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے تو پرانا اجماع ختم ہو جائے گا۔

طریق تشریع:- اسلامی روایت یہ رہی ہے کہ قانون سازی سرکاری مسئلہ نہ ہو' حکومت یا پارلیمنٹ کا مسئلہ نہ ہو' بلکہ ہر فقیہ کو کسی مسئلے کے متعلق اپنی رائے پیش کرنے کی آزادی رہے۔ اس کے باوجود کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بہت سی نادر صورتوں میں ہمارے خلفاء نے بعض احکام دیئے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احکامات صادر کئے کہ مفتوحہ ممالک کو پوری مملکت کے لئے اور ہمیشہ کے لئے مال غنیمت سمجھا جائے یا وقف قرار دیا جائے۔ اس طرح کے شاذ و نادر احکام حکومت کی طرف سے بے شک صادر و نافذ ہوتے رہے۔ لیکن عام قانون سازی کا کام ہمارے فقہا انفرادی طور پر کرتے رہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مساوی رتبے کا کوئی فرد رائے دیتا ہے تو میرے لئے یہ جسارت اور جرات ناممکن ہے کہ اس پر تنقید کروں اور اس کے خلاف رائے دوں۔ اس کے برخلاف اگر حکومت کا فیصلہ ہو تو ظاہر ہے کہ مجھے تذبذب ہو گا اور بعض وقت یہ مشکل ہو گا کہ کسی جابر حاکم کے زمانے میں اس کے فیصلے کے خلاف زبان کھولوں۔ طریقہ کیا ہو گا؟ وہ بیان کر چکا ہوں۔ ہر فقیہ اپنی رائے اور اس کے نفاذ کی صورت بتاتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں ہمارے قاضیوں کو آزادی ہوتی تھی کہ قرآن و سنت کے مطابق جو چاہیں فیصلہ کریں۔ اگر قرآن و حدیث میں کوئی چیز نہ ملے تو فقہا کی رائے میں سے کسی رائے کا انتخاب کریں۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی چیز نہ ہو تو پھر خود اجتہاد کریں اور فیصلے صادر کریں۔ اس طرح عملاً" کوئی دشواری پیش نہیں آئی... قانون کے نفاذ کا کیا طریقہ ہو گا۔ ہمارے افسران عدالت' حکام عدالت اپنی صوابدید پر فیصلہ کیا

کرتے تھے۔ آیا اب یہ مناسب ہے یا نامناسب؟ اس کے بارے میں میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمارا قانون اس زمانے کے مقابلے میں، جب امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے ایک اکیڈمی بنا کر اسلامی قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی تھی۔ فقہی مذاہب کے ذریعے بہت زیادہ معین ہو چکا ہے۔ مثلاً حنفی قانون کیا ہے؟ "ہدایہ"، "قدوری"، "مبسوط" نامی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے مذہبوں میں کہیں کہیں جزوی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اور اس کی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ جس ملک کا حاکم جس مذہب کا ہو، حنفی، شافعی یا مالکی، وہ اس کے مطابق حکم دے سکتا ہے کہ اس ملک کے سارے قاضی مثلاً حنفی قانون کے مطابق عمل کریں گے، چاہے ان کا اپنا مذہب کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ابو یوسف کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے عباسی خلافت کے قاضیوں کے پاس یہ احکام بھیجے تھے کہ وہ حنفی مذہب کے مطابق فیصلے کیا کریں چنانچہ یاقوت لکھتا ہے کہ بعض لوگ جو معتزلی یا غیر حنفی تھے وہ بھی احکام سلطانی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

عدلیہ:- اب اپنے موضوع کے دوسرے جز پر توجہ کرتا ہوں جو عدل گستری کے متعلق ہے۔ عہد نبوی ؐ کی عدل گستری کی اہمیت اور اس زمانے کی اصلاحات کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عدل گستری کا کیا نظام تھا؟ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ عہد نبوی ؐ میں کیا انقلاب آیا، کیا کایا پلٹ ہو گئی اور اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے زمانہ جاہلیت کے عرب میں کوئی حکمران، کوئی حکومت نہ تھی۔ کوئی عدالت بھی نہیں ہوا کرتی تھی لہٰذا کسی شخص کو انصاف حاصل کرنے کے لئے کسی کے پاس جا کر شکایت کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا، مظلوم کیا کرے، "دست خود بدہان خود" ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اپنے ظالم سے بدلہ لے گا۔ اگر ظالم کمزور ہو تو بدلہ آسان تھا لیکن اگر ظالم قوی تر ہو تو کمزور کے لئے کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ انصاف حاصل کر سکے۔ اس صورتحال میں کہیں کہیں ہمیں بہت ہی مدہم روشنی نظر آتی ہے وہ یہ کہ کچھ کم ظالم شخص دو آدمیوں کے جھگڑے کو چکائے گا۔ ایسی صورت میں اس پنچ یا ثالث کو ایک طرح کا عارضی حاکم عدالت بنا لیا جاتا تھا اور اس کے فیصلے پر فریقین عمل کرتے۔ اس کی کچھ مثالیں زمانہ جاہلیت میں ہمیں ملتی ہیں۔ طائف کے قریب عکاظ میں ایک میلہ لگا کرتا تھا، جس میں بیرونی ممالک سے بھی لوگ آیا کرتے تھے اس میلے کے لئے ایسے حکم مقرر کئے جاتے تھے جو دو تین دن کے لئے عارضی

طور پر ہوتے تھے۔ جب تک میلہ لگا رہتا' اس وقت تک ان کی حیثیت حکم کی ہوتی۔ میلے میں جتنے تجارتی جھگڑے پیش آتے' ان کی طرف رجوع کیے جاتے اور وہ فیصلے دیتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کون حکم ہے۔ اس لئے لوگ اگر آپس میں طے کر چکے ہوں کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ حکم سے کرائیں گے تو وہ میلے کا انتظار کرتے۔ میلے کے حکم کے پاس جاتے' اس سے اپنا فیصلہ کراتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عرب میں اس اندھیر نگری کے اندر بھی کہیں کہیں کچھ روشنی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جہاں تک مکے کا تعلق ہے' ہمیں وہاں شہر کے باشندوں کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے تین چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک دیوانی عدالت جس کے حاکم عدالت خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ دوسری فوجداری عدالت' ان دونوں کے علاوہ ایک اور ادارہ وہاں پایا جاتا تھا جسے حلف الفضول کا نام دیا گیا ہے۔ یہ (Order of Chivalry) کی صورت تھی۔ مکے والوں نے ایک زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارے شہر میں بعض وقت اجنبیوں پر بے وجہ ظلم ہوتا ہے' جس سے شہر بھر کی بدنامی ہوتی ہے۔ چنانچہ واقعتہ" ابو جہل کی وجہ سے ایک شخص نے ایک نظم بنائی جس میں مکہ والوں کو گالیاں دیں۔ ابو جہل نے تو کوئی پروانہ کی لیکن دوسرے اہل مکہ کو چوٹ لگی۔ ان حالات میں انہوں نے آپس میں جمع ہو کر معاہدہ کیا کہ ہم میں سے کم از کم چند لوگوں کو چاہیے کہ رضاکارانہ طور پر اس بات کا اقرار کریں کہ جب کبھی ہمارے شہر کے اندر کسی اہل مکہ یا کسی اجنبی پر اگر کوئی ظلم ہو تو ہم مظلوم کی مدد کریں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک کہ اسے انصاف نہ دلایا جائے۔

دنیا کا پہلا تحریری دستور:۔ جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں سوائے اس کے کوئی امکان نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مدد آپ کرے۔ ان حالات میں مدینہ تشریف لانے کے بعد جب شہری مملکت قائم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا دستور مدون فرمایا اور دنیا کا پہلا دستور تحریری طور پر منضبط کر کے نافذ بھی کیا۔ اس میں ایک عجیب و غریب حکم دیا گیا جسے انقلابی نوعیت کا کہا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ انصاف بجائے انفرادی کے مرکزی شے ہو گا۔ یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو وہ براہ راست فرد کو سزا نہیں دے گا بلکہ مرکزی عدالت سے رجوع کرے گا۔ حاکم عدالت بغیر رعایت کے پوری غیر جانبداری کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ کرے گا اور ظالم کو سزا دے کر مظلوم کو اس کا حق دلائے گا۔ اس کے بارے میں کچھ دفعات اور بھی ہیں۔ وہ یہ کہ کسی شخص کو ظالم کی حمایت کرنے کا

حق نہیں ہو گا' چاہے اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ میرے بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا ہو تو باوجود باپ ہونے کے مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کروں اور پولیس کی طرف سے اس کی گرفتاری کے وقت مدافعت کروں۔ اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ انصاف ایک خدائی حکم ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ انصاف کے لئے پورا تعاون کرے اور کسی ظالم کو نہ بچائے' چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی حد تک ایک انقلابی حکم دیا گیا اور انصاف جو وہاں انفرادی کام تھا' اس کو ایک مرکزی اور حکومتی فریضہ قرار دیا گیا۔

دو نئے ادارے:- اس کے بعد ہمیں مدینے میں دو نئے ادارے (Institution) قائم ہوتے اور ترقی کرتے نظر آتے ہیں' جو بعد میں سارے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ ایک مفتی کا ادارہ ہے اور دوسرا قاضی کا۔ مفتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ فتویٰ دے یعنی ہم اس سے قانون معلوم کریں۔ قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ دوسرا ادارہ قاضی کا ہے۔ عہد نبویؐ میں ہمیں قاضی بہت سے ملیں گے۔ لیکن شہر مدینہ میں مستقل قاضی کا پتا کم از کم مجھے نہیں ملتا۔ البتہ مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ عارضی طور پر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو نامزد کرتے اور کہتے کہ فریقین کے بیانات کو سن کر یا برسر موقعہ جا کر' حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرو۔ گویا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہوتا تھا' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ نائب نے وہ فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ جو خاصی اہمیت کا حامل ہے وہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے مہاجرین میں جو بہت ذہین تھے اور قانونی نقطہ نظر سے ان کی مہارت بے انتہا تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ فلاں مقدمے میں تم فیصلہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں' "لیکن کس اساس پر" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مفہوم کو سمجھ کر جواب دیتے ہیں کہ اگر تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے تو انصاف رسانی اور حق و عدل کی بنا پر دو ثواب ملیں گے۔ اس کے برخلاف اگر تم صحیح نتیجے پر نہ پہنچو تو تمہارا فیصلہ اصولاً غلط ہو گا۔ اگر ناانصافی ارادۃ" نہیں بلکہ اتفاقاً" ہوئی ہو تو تمہارے حسن نیت کی وجہ سے تم کو ایک ثواب ضرور ملے گا کہ تم نے انصاف کرنا چاہا تھا۔ ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قاضیوں کی آراء میں اختلاف ہوتا تھا۔ اس کا آغاز عہد نبویؐ ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور بعد کے زمانے میں بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ

علیہ نے اپنے زمانے میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو کوشش کی تھی، اور چالیس ممبروں کی ایک اکیڈمی بنائی تھی' جس نے اسلامی قانون کو مدون کیا' اس کی وجہ اور اس کا باعث یہی تھا کہ مختلف قاضیوں کے فیصلے میں تضاد ہوتا تھا ایک ہی قسم کا مقدمہ ہو' ایک قاضی "الف" ایک فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا قاضی "ب" دوسرا فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک کتاب جس کا نام "رسالتہ الصحابہ" ہے' ابن المقفع کا خط ہے جو اس نے اپنے ہم عصر خلیفہ منصور کے نام لکھا تھا' اس میں وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ امیرالمومنین ہمارے زمانے میں قاضیوں کے فیصلوں میں اختلاف کے باعث بے انتہا دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک ہی مسئلے پر دو قاضی مختلف فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک قاضی کے مطابق سزائے موت دینی چاہیے دوسرے کے مطابق اس قسم کے مقدمے میں سزائے موت نہیں دینی چاہیے۔ اسی طرح ایک اور مقدمے میں' ایک قاضی کی رائے کے مطابق ایک خاص صورت میں طلاق پڑ چکی ہے' دوسرا قاضی کہتا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی۔ تو ہماری عزت و آبرو غیر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حق کیا ہے؟ ایسی مثالیں دے کر وہ ایک تجویز پیش کرتا ہے جو میری دانست میں نامناسب تھی اور خلیفہ منصور نے بھی اسے رد کر دیا' لیکن بظاہر معقول نظر آئے گی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ امیرالمومنین سارے قاضیوں کے پاس احکام بھیجیں کہ اپنے فیصلوں کی نقلیں خلیفہ کے پاس اپنی اپنی دلیلوں کے ساتھ روانہ کیا کریں۔ اگر امیرالمومنین کو اس میں کوئی نامناسب چیز نظر آئے تو وہ خود حکم دیں اور خلیفہ کا حکم بعد میں سارے قاضیوں کے لئے واجب التعمیل ہو جائے گا اور ہمیں اختلافی نظائر سے نجات مل جائے گی' اور کسی مسئلے میں اختلاف رائے یا دو مختلف نظریئے موجود ہوں اور قاضی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کرنا چاہیے تو صرف اپنی صوابدید کی بجائے امیرالمومنین کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اور اس طرح سارے ملک میں ایک قانون بن جائے گا۔ لیکن خلیفہ نے نہ صرف اس تجویز کو رد کر دیا بلکہ معلوم نہیں اس بنا پر یا کسی اور وجہ سے مقفع کے قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔ بہرحال میں نے ایک قیاس ظاہر کیا تھا کہ اسلام میں ایک روایت (Tradition) یہ رہی ہے کہ عہد نبویؐ سے لیکر آج تک عدالت کی طرح قانون سازی بھی حکومت اور سیاست کے تحت نہیں رہی۔ اگر خلیفہ منصور اس تجویز کو قبول کر لیتا تو اس کے بعد قانون سازی سیاست کے تابع ہو جاتی' خلیفہ کے احکام کے تابع ہو جاتی۔ خلیفہ اچھے بھی آتے ہیں اور برے بھی۔ آئے دن قانون بدلتے رہتے۔ ایک پرانے

قانون کو نیا خلیفہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن اگر اسلامی قانون حکومت اور ریاست کے عمل دخل سے آزاد ہے تو تمام فقہا مساوی درجہ رکھنے کے باعث ایک دوسرے پر اعتراض کر سکیں گے۔

جہاں تک وکیلوں کا تعلق ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گو عہد نبویؐ میں آج کل کی طرح وکیل نہیں پائے جاتے تھے لیکن مجھے قرآن مجید میں اس کی طرف کچھ اشارہ ملتا ہے۔ ایک آیت ہے کہ قیامت کے دن کافروں کی طرف سے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا، تو آج کل کے وکیل کو میں اصولاً اور اساساً ممنوع نہیں قرار دیتا۔ کیونکہ عام کلیہ و قاعدہ ہے جس کا اس آیت میں اشارہ ہے۔ "**واحل لکم ماوراء ذالکم...**" (24:4) یعنی پہلے چند چیزیں بتائی گئی ہیں کہ یہ حرام ہیں۔ پھر اس کے بعد، اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں، وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔ فرض کیجئے کہ وکیل کی ممانعت نہ ہو تو ہمارے لئے جائز ہو جائے گا چاہے وہ عہد نبویؐ میں غیر موجود ہو۔

وکیل کا منشا اصل میں یہ نہیں ہوتا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی مدد کرے۔ اس کے فرائض کی اساس یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو خصوصی تعلق ہے۔ یعنی ملکی قوانین سے واقفیت، اس واقفیت سے وہ اپنے موکل کو مدد پہنچائے اور اسے بتاوے کہ قانون کی روشنی میں وہ کس حد تک اور کیا حق رکھتا ہے۔ قانونی نقطہ نظر، قانون کی ٹیکنیکل باتوں کو عدالت کے سامنے واضح کرنے کے لئے وکیل کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کا کردار یہی ہونا چاہیے کہ حق کی تائید کرے۔ یہ نہیں کہ حق کو چھپائے اور عمداً ظالموں اور مجرموں کی مدد کرے۔

یہ ہیں وہ چند باتیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں قانون سازی کا کیا طریقہ تھا؟ اور عہد نبویؐ میں عدل گستری کا کیا قاعدہ تھا؟ عہد نبویؐ میں صوبجات و اضلاع مثلاً یمن میں بہت سے قاضی بھیجے جاتے اور ان کے متعلق بعض تفصیلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ابو موسیٰ الاشعری کو جب قاضی بنایا گیا تھا تو ان کا تقرر نامہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ میں تمہیں فلاں فرض کے لئے مامور کرتا ہوں۔ تم اس طرح سے اپنے فرائض انجام دیا کرنا۔ اسی طرح بعض اور قاضیوں کے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں۔ یوں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں صفر سے شروع ہو کر اسلامی محکمہ قانون سازی اور اسلامی محکمہ عدل گستری کس طرح وجود میں آتے ہیں اور کس طرح بعد کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتے ہیں۔ جب کہ اسلامی مملکت ایک شہر کے ایک جز میں پائی جانے والی مملکت مدینہ پر نہیں بلکہ تین براعظموں میں پھیل جاتی ہے۔

باب 4

نظام دفاع اور غزوات

عہد نبویؐ کی مختلف ہیئتوں میں سب سے مشکل غالباً دفاع کا پہلو ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فن کی الف' ب سے بھی میں واقف نہیں۔ کبھی فوجی زندگی گزارنے یا فوجی تعلیم حاصل کرنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ بہرحال مطالعے میں مجھے جو جو چیزیں دفاع اور فوج سے متعلق نظر آئیں وہی یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔

دفاع کے غیر فوجی انتظامات:۔ کسی ملک کے دفاع کے لئے نہ صرف فوجی تیاری درکار ہوتی ہے بلکہ غیر فوجی انتظامات بھی ضروری ہوتے ہیں مسلمانوں کی سب سے پہلی' بہت ہی ننھی منی سلطنت جو مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی' اس کو ابتدا میں مختلف قسم کی مشکلات سے بچانے کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تدبیروں کا آغاز کیا تھا۔ مکہ معظمہ سے مسلمان ہجرت کر کے مدینے آنے پر مجبور ہوئے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں سے تشریف لائے تو شاید عام حالات میں کسی سلطنت کے قیام کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن مشرکین نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ وطن سے نکالا' وطن میں ان کی جائیدادوں کو ضبط کیا اور انہیں سالہا سال تک ہر طرح کی اذیتیں دیتے رہے۔ جب مسلمان وہاں سے چلے گئے' تب بھی انہیں چین نہیں آیا اور مدینہ والوں کو لکھ بھیجا کہ ہمارے دشمن (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو یا تو جان سے مار ڈالو یا انہیں اپنے ملک سے نکال دو۔ ورنہ ہم کوئی مناسب تدبیر اختیار کریں گے۔ یہ فوجی حملے کی دھمکی ایسی تھی کہ کوئی شخص آسانی سے اس کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا' خاص طور پر وہ نبی جو دنیا کے سارے لوگوں کے لئے اسوہ حسنہ تھا۔ بادشاہوں کے لئے بھی' فقیروں کے لئے بھی' عالموں کے لئے بھی اور جاہلوں کے

لئے بھی۔ آپؐ نے آنے والے مسلمان حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے لئے ایک سبق آموز نمونہ چھوڑا ہے۔

اولین مسئلہ یہ تھا کہ مہاجرین کو کس طرح روزگار پر لگایا جائے اور کس طرح ان کی فوری ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ اس کے لئے آپؐ نے مواخات کا ادارہ قائم کیا' جس نے طرفۃ العین میں ان کی ساری مشکلات کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد دوسری تدبیر یہ فرمائی کہ چونکہ شہر مدینہ میں کوئی سلطنت نہیں پائی جاتی تھی۔ وہاں صرف قبیلے ہی قبیلے تھے اور قبیلے سالہا سال سے خانہ جنگیوں میں مشغول تھے' ان میں باہمی نفرت' حسد' جلن اور دشمنی پائی جاتی تھی اور اگر ان قبیلوں میں سے کسی ایک قبیلے پر ان کا دشمن حملہ کرتا تو دوسرے لوگ غیر جانبدار رہتے تھے' نتیجۃً اسے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا' ان حالات میں انتہائی فراست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت کے باشندوں یعنی شہر مدینہ کے لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اپنے مذہبی اختلافات اور قبائلی انفرادیت کے باوجود یہ مناسب ہو گا کہ تم سب مل کر ایک چھوٹی سی مملکت قائم کر لو۔ آپس میں ایک مرکزیت پیدا کر لو اور اپنے دشمن کے مقابلے کے لئے اپنی موجودہ قوت کو اس طرح مجتمع کر لو کہ اس کا کوئی جز ضائع نہ ہونے پائے۔ اس تجویز کو قبول کر لیا گیا اور ایک مملکت قائم ہوئی جو شہر مدینہ کے بڑے حصے پر مشتمل تھی۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی شریک تھے اور جو مشرک قبیلے اسلام نہیں لائے تھے وہ بھی اس میں داخل ہوئے۔ ان سبھوں نے بالاتفاق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کیا۔ جو اختیارات مرکز کے تھے وہ مرکز کے سپرد کیے گئے اور بہت سے معاملات میں ہر قبیلے کی داخلی خود مختاری قائم رہی۔ جو چیزیں مرکز کے سپرد کی گئیں ان میں سب سے اہم فوجی دفاع کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ صراحت کے ساتھ اسے مملکت کے دستور میں تحریری طور پر لکھا گیا (اور یہ ہم تک بھی پہنچا ہے) کہ جب کبھی دشمن سے مقابلہ ہو گا تو اس کا انتظام رسول اکرمؐ کریں گے۔ اگر فوج باہر جا کر لڑنے پر مجبور ہو گی تو اس کا اختیار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گا کہ کس کو فوج میں رہنے کی اجازت دیں اور کس کو فوج میں داخل ہونے سے روک دیں تاکہ دشمن کے جاسوس یا منافق اور غدار لوگ شریک ہو کر اندرونی طور پر نقصان نہ پہنچا سکیں یہ ابتدائی انتظامات تھے۔

قبائل سے معاہدات:- دفاع کے انتظامات میں بعض غیر فوجی کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ اس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں۔ جیسے ہی یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے' یعنی مہاجرین کا مسئلہ ختم ہو

گیا اور مملکت یعنی شہر مدینہ کے سارے قبائل کی ایک تنظیم عمل میں آگئی تو فوراً ہی رسول اکرمؐ نے دورے کرنے کا آغاز فرمایا۔ پہلے شمال کی طرف گئے۔ مدینے سے شمال کی طرف تین چار دن کی مسافت پر قبیلہ جہینہ بستا تھا' اس کے علاقے میں گئے۔ اس کی تفاصیل تو ہمارے پاس نہیں۔ البتہ معاہدہ کی تفصیلات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ مسلمان نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے ساتھ فوجی حلیفی پر تیار تھا۔ غالباً رسول اکرمؐ نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہوگی کہ تم تنہا ہو' تمہارے دشمن موجود ہیں' اگر وہ تم پر حملہ کریں گے تو کوئی تمہیں مدد نہیں دے گا۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم اور ہم آپس میں دوستی کرلیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم پر کوئی حملہ کرے گا تو ہم تمہاری مدد کو دوڑے آئیں گے اور اگر ہم پر کوئی حملہ کرے اور ہم تمہیں بلائیں تو تم بھی ہماری مدد کو آنا۔ بات معقول تھی۔ اس قبیلے نے قبول کرلیا۔ چنانچہ معاہدے میں صراحت ہے کہ صرف فوجی معاہدہ ہے اس کا دینی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

اس ابتدائی کامیابی کے بعد رسول اکرمؐ مدینے کے جنوب کی طرف جاتے ہیں وہاں کے قبائل سے بھی ایسی ہی مفاہمت کرتے ہیں۔ جنوب کے قبائل بھی مسلمان نہ ہونے کے باوجود جنگی حلیفی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مشرق کی طرف جاتے ہیں وہاں کے قبائل سے بھی دوستی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے پانچ سات معاہدے تاریخ میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان پر غور کیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مدینے کی بستی یا شہری ریاست کو محفوظ کرنے کی تدبیر اس انداز سے کی جا رہی ہے کہ مدینے کے اطراف کے علاقوں کو دوست بنا لیا جائے تاکہ اگر دشمن مدینے پر حملہ کرنا چاہے تو براہ راست مدینے تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ مدینے تک پہنچنے سے پہلے ہی درمیان کے علاقہ میں اس کو روکاٹوں سے سابقہ پڑے۔ ہمارے دوست قبائل کی مدد سے اس دشمن کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ گویا ایک حلقہ (Cordon) قائم ہو گیا۔ وہ مدینے کی حفاظت کے لئے مدینے کے اطراف دوستوں کی بستیاں قائم کرتے ہیں اور ان دوستوں کی مدد سے' جنگی نقطہ نظر سے مدینہ کی حفاظت عمل میں آتی ہے۔ یہ ایک پہلو تھا۔

معاشی زد:- اس قسم کی چیزیں ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ اشارۃً" مثال کے طور پر یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ فوجی حفاظت کے لئے غیر فوجی اور سیاسی طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ایک نمونہ پیش کیا۔

کس طرح آپؐ نے مسلمانوں کی اس ابھرنے والی ' چھوٹی سی سلطنت کو ' جس کے بہت سے دشمن تھے ' ان سے محفوظ رکھنے اور بچانے کا انتظام کیا۔ ابتدائی معاہدہ جو مدینے کے اطراف کے قبیلوں سے کیا گیا تھا ' وہ مکے کے لوگوں کی دشمنی اور انتقام سے بچاؤ کی ایک صورت تھی۔ مکے والوں نے کئی مسلمانوں کو ستایا ' ان کو قتل کیا اور جب وہ وہاں سے ہجرت کر کے مدینے آئے تو ان کی جائیدادیں بھی ضبط کر لیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو قانون فطرت کے تحت یہ حق حاصل تھا کہ ان سے جانی اور مالی دونوں طرح سے انتقام لیں۔ ابھی مسلمانوں کے پاس اتنی فوجی قوت نہیں تھی کہ جانی نقصان پہنچائیں لیکن مسلمانوں نے حضور اکرمؐ کے ایماء پر انہیں مالی نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔

مکہ کے قریش اپنی گزر اوقات کے لئے تجارت کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے کاروان تجارت جو جنوب میں یمن وغیرہ کی طرف جاتے تھے ان کو مسلمانوں سے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن جب ان کے کارواں شمال میں عراق ' شام یا مصر کی طرف جاتے تو مدینے کے قریب سے گزرنا ناگزیر تھا۔ رسول اکرمؐ نے اعلان فرمایا کہ تم ہمارے علاقے سے نہیں گزر سکتے۔ ہمارے علاقے سے مراد مدینے کا شہر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے جو حلیف قبیلے تھے اس علاقے سے بھی ان کا گزرنا ممنوع ہو گیا۔ یہ قریش کے لئے سخت ناگوار بات تھی کہ ان کی تجارت میں رکاوٹ پڑے۔ انہوں نے نہ مانا بلکہ اصرار کیا کہ ہم ضرور گزریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمان مٹھی بھر تھے اور ایک ایسے ملک میں تھے جہاں سوائے خود رو گزرگاہوں کے کوئی سڑک نہیں پائی جاتی ایک جگہ آپ روکیں تو بہت سے راستے اور پیدا ہو جاتے ہیں جہاں سے آدمی گذر سکتے ہیں۔ ان حالات میں قریشی کاروانوں کو روکنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لئے بارہا ان کو روکنے کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ چنانچہ جنگ بدر سے قبل تقریباً سات مرتبہ مسلمان فوجیں یہ اطلاع ملنے پر کہ قریشی قافلہ گذر رہا ہے اس کو روکنے کے لئے گئیں لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا بلکہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ مگر کوششیں جاری رہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے وسائل کو ترقی دی جانے لگی۔ دوستوں کی تعداد بڑھائی جانے لگی۔ غرض جو تدبیریں ممکن تھیں وہ اختیار کی جاتی رہیں۔ اس کے بعد جب قریش نے دیکھ لیا کہ مسلمان ان کو آسانی سے گزرنے نہیں دیں گے تو انہوں نے زبردستی گزرنے کی ٹھان لی۔

جنگ بدر سے عین قبل کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ وہ

شمال کی طرف گئے ہیں تو آپؐ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ دشمن اسی راستے سے واپس آئے گا، کسی اور راستے سے وہ نکل نہیں سکتا۔ لہٰذا دو جاسوس مقرر کئے کہ تم بھی شام کو جاؤ۔ اس کارواں کے قریب رہو۔ جیسے ہی وہ واپسی کا انتظام کرکے، واپسی کا ارادہ کرے، تیزی سے آکر ہمیں اطلاع دو کہ دشمن اب آنے والا ہے۔ تجارتی کارواں اور جاسوسوں کی رفتار تقریباً یکساں ہی تھی کیونکہ اونٹوں کے سوا اور کوئی تیز رو سواری میسر نہیں تھی۔ دل چسپ بات یہ کہ جب یہ دونوں جاسوس تیزی سے مدینے واپس آئے تو دیکھا کہ رسول اکرمؐ کو کارواں کی آمد کی اطلاع دیگر وسائل سے ہو چکی ہے، اور وہ مدینے سے روانہ بھی ہو چکے ہیں۔ اس سے یہ استنباط کرنا پڑتا ہے کہ رسول اکرمؐ مختلف وسائل اختیار فرماتے تھے تاکہ دشمن کی خبریں مسلمانوں تک پہنچتی رہیں اور اس کی بھی کوشش کرتے کہ ہماری خبریں دشمن تک نہ پہنچ پائیں۔ غرض رسول اکرمؐ مدینے سے نکل چکے تھے اور فوجی فراست کی بدولت مدینے کے شمال کی طرف جانے کی بجائے مدینے کے جنوب کی طرف جاتے ہیں تاکہ دشمن سے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں جہاں دشمن کا روکنا ممکن ہو۔ اس کے لئے بدر کا مقام منتخب کیا گیا۔ مجھے وہاں جانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ یہ مقام ایسا ہے جو بلند پہاڑیوں کے درمیان تنگ وادیوں میں سے گزرتا ہے۔ تاہم آسانی کے ساتھ یہ ممکن نہیں تھا کہ مسلمان ایک ایسے مقام پر قیام کریں جہاں تنگ راستہ ہو۔ وہ پہاڑوں میں چھپے رہیں، دشمن بے خبری میں آئے اور وہ اس پر چھاپہ مار سکیں۔ مختصر یہ کہ مختلف مقامات پر دریافت کرتے ہوئے جاتے ہیں کہ دشمن کی کوئی اطلاع ہے۔ لکھا ہے کہ بعض اوقات مسلمانوں کی فوج کے کچھ لوگ نکلتے اور سکاؤٹنگ کرتے اور بعض اوقات رسول اکرمؐ بھی اپنے ساتھ ایک دو صحابہ کو لے کر نکلتے اور راستے میں کوئی بدوی ملتا تو اس سے پوچھتے کہ تمہیں اطلاع ہے کہ قریش کا کارواں اس وقت کہاں ہوگا۔ اس سے بھی آپؐ کو کچھ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک دشمن کا کارواں وہاں سے نہیں گزرا۔ مشورہ ہوتا ہے کہ کہاں ٹھہرانا چاہیے؟ ایک مقام کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بدر کے شمال میں ہے اور بہت ہی تنگ درہ ہے۔ مسلمان وہاں قیام کرتے ہیں۔ دو ایک دن بعد دشمن کا کارواں وہاں پہنچ جاتا ہے۔

اس سے پہلے دشمن کو تجربہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ جاتے وقت بھی پیچھا کیا تھا حتی کہ لڑنا چاہا تھا۔ لہٰذا وہ اب چوکس اور چوکنے تھے۔ قافلے کو بدر کے درے میں سے گزرنے سے پہلے ہی ایک مقام پر ٹھہرا دیا گیا اور قافلے کا سردار ابو سفیان تن تنہا بدر

کے شہر میں آتا ہے جہاں سے وہ اکثر گزرا کرتا تھا۔ وہ وہاں کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس لئے وہاں جا کر سب سے پہلے اس مقام پر پہنچتا ہے' جہاں لوگ مل سکتے ہیں۔ یہ مقام وہاں کا ایک طرح سے کلب تھا۔ وہاں لوگوں کے لئے ایک ہی کنواں تھا' کوئی نہ کوئی آدمی ہر وقت وہاں مل سکتا تھا یا تھوڑی ہی دیر میں کوئی نہ کوئی شخص آ جاتا تھا۔ ابو سفیان وہاں پہنچتا ہے اور بعض پانی بھرنے والے مردوں یا عورتوں سے معلوم کرتا ہے کہ قبیلے کا سردار اس وقت کہاں ہے؟ پھر اس سے جا کر ملتا ہے اور اس سے گفتگو کرتا ہے۔ وہ سردار ابو سفیان سے کہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز میرے دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی جس سے یہ گمان ہو کہ یہاں کوئی بڑی فوج تمہارے مقابلے کے لئے آئی ہوئی ہے۔ البتہ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بدوی یہاں سے اونٹوں پر گزرے انہوں نے اتر کر کنویں سے پانی پیا اور پھر چلے گئے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز میرے علاقے سے نہیں گزری۔ ابو سفیان احتیاط سے آگے بڑھتا ہے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کچھ اونٹوں کی مینگنیاں پڑی دیکھتا ہے۔ ایک مینگنی اٹھاتا ہے۔ اس کو چیر کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے اس کے اندر گھاس نہیں بلکہ کھجور کی گٹھلی ہے۔ وہ چلا اٹھتا ہے کہ یہ مقامی اونٹ سوار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو مدینے کے اونٹ ہیں کیونکہ مدینے ہی میں کھجور کی گٹھلیاں مل سکتی ہیں۔ اس کے لید کے اندر جو کھجور کی گٹھلی پائی جاتی ہے لہٰذا یہ مدینے سے آئے ہوئے مسلمان ہی ہوں گے۔ وہ پوری تیزی سے بھاگتا ہے' اپنے کارواں میں پہنچتا ہے اور اس کو بدر سے باہر سمندر کے کنارے ہی کنارے ایک منزل کی جگہ دو منزل کرتا ہوا' تھکے ہوئے قافلے کو آرام کا موقعہ نہ دے کر' آگے بڑھ جاتا ہے اور بالآخر مسلمانوں کی دسترس سے بچ جاتا ہے۔ بچنے سے پہلے وہ ایک شخص کو انعام دے کر یہ کہتا ہے کہ پوری تیزی کے ساتھ مکہ جاؤ اور مکے کے لوگوں کو اطلاع دو کہ دشمن (یعنی رسول اکرمؐ) ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔ تمہارا مال لٹ جائے گا۔ لہٰذا ہماری مدد کو آؤ۔ وہ شخص مکہ پہنچتا ہے اس احتیاطی تدبیر کے بعد جب ابو سفیان کا کارواں دو منزل سفر کے بعد اطمینان محسوس کرتا ہے تو پھر ایک نیا پیام رساں اہل مکہ کو روانہ کرتا ہے کہ تمہارے آنے کی ضرورت نہیں میں بچ چکا ہوں۔ مگر جو فوج مکہ سے روانہ ہو چکی تھی اس کا سردار ابو جہل تھا' اس نے کہا کہ ایسے دشمن کا خاتمہ کر دینا چاہیے ورنہ آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں ہمیں نقصان پہنچائے گا۔ ہم کافی جمعیت کے ساتھ نکلے ہیں اور ہم میں یہ قوت ہے کہ اس خطرے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں۔

غزوہ بدر:- رسول اکرمؐ اپنے چھپے ہوئے مقام پر ایک دن، دو دن، تین دن انتظار کرتے رہے۔ ابو سفیان کے کارواں کا کوئی پتہ نہ چلا۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ وہ گزر چکا ہے۔ آپؐ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے ہیں کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا چاہیے۔ کیا اسی مقام پر یا کسی اور مقام پر؟ صحابہ کے مشورہ سے آپؐ شہر کا اندرونی حصہ منتخب کرتے ہیں جہاں کنواں تھا۔ اس میں مصلحت یہ سوچی کہ مکہ والے بدر آئیں گے تو انہیں پانی کی ضرورت ہوگی اور پانی کا صرف یہی ایک ہی کنواں ہے۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں رہے گا تو دشمن پیاسا مرے گا اور اس طرح ہم دشمن پر جنگی نقطہ نظر سے فوقیت حاصل کریں گے۔ لہٰذا رسول اکرمؐ اس شمالی درے سے نکل کر شہر کے بیچ میں آتے ہیں اور کنویں کے طرف قیام کرتے ہیں۔ بعض صحابہ کے مشورے سے ایک بڑا گڑھا بھی کھودتے ہیں تاکہ اس کو پانی سے بھر دیں۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ جنگ کے دوران ہم میں سے اگر کسی کو پیاس لگے تو اس گہرے کنویں سے پانی نکالنے اور پینے میں وقت لگے گا اور اس اثناء میں دشمن ہم پر حملہ کر کے مار بھی سکتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہو گا کہ ایک گڑھا ہو جس میں پانی بھر دیا جائے اور ہمارے سپاہی وہاں پہنچ کر فوراً ہی چلو سے پانی پی لیں۔ دشمن اگر یہاں آئے اور پانی پینا چاہے تو اس کی نگرانی کے لئے کچھ لوگ یہاں متعین رہیں گے یہ تدبیریں آج ہمیں معمولی محسوس ہوتی ہیں لیکن اس زمانے میں فوجی نقطہ نظر سے نہایت کار آمد ثابت ہوئیں۔ اسی اثناء میں دشمن کی مکہ سے آنے والی فوج ابو جہل کی سرداری میں وہاں پہنچ گئی۔ دشمن کی فوج کی تعداد معلوم کرنے کے لئے ایک نگران دستہ (Patrol) بھیجا گیا۔ اس نے دو آدمیوں کو گرفتار کیا جو کنویں کی طرف پانی بھرنے کے لئے آ رہے تھے۔ انہیں پکڑ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ اس وقت آپؐ نماز پڑھ رہے تھے سپاہیوں نے ان دونوں سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔ انہوں نے انہیں مار پیٹ کر کہا کہ تم حقیقت میں ابو سفیان کی فوج کے آدمی ہو۔ انہوں نے کہا، نہیں، ہم ابو سفیان کے لوگ نہیں۔ پھر ذرا ٹھہر کر دوبارہ پوچھا کہ تم کون ہو تو وہ کہتے ہیں کہ مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ فرماتے ہیں۔ جب وہ سچ کہتے ہیں تو تم انہیں مارتے ہو اور جب جھوٹ کہتے ہیں تو انہیں چھوڑ دیتے ہو۔ خیر اس کے بعد رسول اکرمؐ ان لوگوں سے سوال کرنے کے لئے متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو فوجی نقطہ نظر سے اہم ہیں۔ ان سے

پوچھا' تم کون ہو؟ کہا "ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔" بہت اچھا۔ تم کتنے آدمی ہو؟ جواب دیا۔ "ہمیں معلوم نہیں۔" واقعی ان کو معلوم نہیں تھا۔ پھر کیسے معلوم کریں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھتے ہیں "یہ بتاؤ کہ روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہو؟" انہوں نے کہا۔ "ایک دن نو' ایک دن دس" تو حضور اکرم نے فوراً استنباط کیا کہ ان کی تعداد ایک ہزار سے نو سو کے مابین ہو گی۔ کیونکہ ایک اونٹ ایک سو افراد کے لئے کافی ہوتا ہے۔ حقیقتاً ان کی تعداد 950 تھی۔ ان سے پوچھا گیا "فوج میں کون کون لوگ موجود ہیں؟ فلاں فلاں سردار؟" غالباً اس سے اندازہ لگایا ہو گا کہ جنگ کے وقت فوج کی کمانداری کون کون کرے گا۔ میمنہ میں کون ہو گا۔ میسرہ میں کون ہو گا۔ مختلف مقامات پر کون کون مکہ والے ہوں گے۔ ان کے ناموں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واقف تھے۔ کیونکہ وہ ہم وطن تھے۔ اس طرح کچھ معلومات ان قیدیوں سے حاصل کی گئیں۔

اس کے بعد صبح جنگ شروع ہونے والی تھی۔ رات کو جو طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہا وہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے تو کچھ دیر آرام فرمایا۔ پھر بہت سویرے اپنی چھوٹی سی فوج جس میں تین سو بارہ آدمی تھے' اس کی تقسیم کی اور کہا کہ یہ فوج کا مقدمہ ہے' یہ سامنے رہے گا۔ یہ دائیں ہاتھ پر میمنہ' یہ بائیں ہاتھ پر میسرہ۔ یہ قلب اور یہ ساقہ۔ گویا فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کے بعد ہر ایک کے افسر مقرر کئے' اس کا سردار فلاں ہو گا' اس کا سردار فلاں ہو گا۔ یہ انصاری' یہ مہاجر وغیرہ۔ اس کے بعد کچھ تفصیلات اور ملتی ہیں جو فوجی نقطہ نظر سے آئندہ آنے والے سپہ سالاروں کے لئے نمونہ ہیں۔ نبی ہونے کے باوجود' خدا کی حفاظت کا یقین ہونے کے باوجود' انتظامی طور پر آپ یہ تدبیر اختیار کرتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک جھونپڑا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ جنگ کے وقت رسول اکرمؐ اس جھونپڑے کے اندر رہ کر مشاہدہ کرتے رہیں اور حسب ضرورت فوج کو آگے بڑھائیں یا پیچھے ہٹائیں تاکہ دشمن کے کمزور حصے کو دیکھ کر اس پر حملہ کیا جائے' جہاں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہو دیکھ کر کمک بھیجی جائے۔ یہ بھی خیال رکھا گیا کہ وہ مقام کھلا ہوا نہ ہو تاکہ دشمن کے تیر آپؐ کو نہ لگیں۔ ایک جھونپڑا سا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر دشمن کے تیروں سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے فوجی قیادت کے فرائض آپؐ خود انجام دے سکیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہاں دو تیز رفتار اونٹنیاں بھی مامور کی جاتی ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے

کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو تو رسول اکرمؐ ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر فوراً مدینہ منورہ چلے جائیں تاکہ (نعوذ باللہ) آپؐ کی شہادت کی نوبت نہ آئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس قدر فراست سے آپؐ جنگ کا انتظام فرماتے ہیں۔

یہاں واضح ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اسوہ حسنہ قائم کرنا تھا اور وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ بعد میں آنے والے بادشاہ اور کمانڈر کس طرح اپنے متعلق انتظامات کریں۔ اگر بادشاہ مر جائے، کمانڈر انچیف مر جائے تو صرف فوج کے باقی رہنے سے ہمارا کام نہیں بنے گا۔ اس لئے کہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ بادشاہ اور کمانڈر کی جان بچائی جائے۔ غرض یہ کہ یہ انتظام رسول اکرمؐ نے صحابہ کے مشورے سے کیا تھا۔ اس کا منشا یہ دکھانا تھا کہ آئندہ مسلمان حکمران کس طرح اس صورت حال میں کام انجام دیں۔ یہ سوال کہ بعد کے غزوات میں رسول اکرمؐ نے ایسا اقدام کیوں نہیں کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ جس مقام پر جنگ ہوئی اس کے لحاظ سے ایسا کیا گیا۔ لیکن جب مسلمان مکہ جاتے ہیں جہاں بغیر لڑائی کے قبضہ ہو گیا، ان حالات میں وہاں جھونپڑی بنا کر دور سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غرض یہ ایک ٹیکنیکل چیز تھی کہ کس وقت حضور اکرمؐ نے کس طرح اپنا کام سرانجام دیا۔

مسلمانوں کے تین سو بارہ اور دشمن کے نو سو پچاس آدمی تھے۔ مسلمانوں کی پوری فوج میں شاید دو گھوڑے تھے اور دشمن کے پاس ایک سو سے زائد گھوڑے تھے۔ مسلمانوں کے پاس دس بارہ بکتر ہوں گے۔ دشمن کے پاس دو سو بکتر تھے۔ گویا ہر لحاظ سے دشمن مسلمان فوج سے طاقت ور اور قوی تھا۔ اس انتظام کے بعد رسول اکرمؐ اس جھونپڑی ہی میں جو آپؐ کے لئے تعمیر کی گئی تھی، خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور دعا کی۔ وہ دعا بھی نہایت اثر انگیز تھی۔ دعا یہ تھی "اے اللہ! اگر تو چاہتا ہے کہ دنیا میں آئندہ کوئی تیری عبادت نہ کرے، تو اس چھوٹے سے دستے کو شکست دے دے۔ اس کے برخلاف اگر تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت ہوتی رہے تو اس چھوٹے سے دستے کو بڑے دستے پر غلبہ عطا کر" اس کے بعد آپؐ باہر نکلتے ہیں۔ فوج سے مخاطب ہوتے ہیں کہ "تم اس وقت ساری دنیا میں خدا کی خدائی کے واحد ذمہ دار ہو۔" یہ ولولہ دلوں میں پیدا ہوا ہو گا کہ ہم ہی وہ واحد جماعت ہیں جو اس وقت خدا کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ باقی سب خدا کے دشمن ہیں۔ اس جوش و ولولہ کے باعث ایک ایک آدمی کو ہزار ہزار آدمی کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اب وہ جان پر کھیل جائے

گا۔ آج کل کی فوجوں کی طرح نہیں جنہیں شراب پلا کر لڑائی کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے' بلکہ اس جذبے کے ذریعے ان میں جوش بھر دیا جاتا ہے کہ تم جس مقصد کے لئے جنگ کر رہے ہو وہ دنیا کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ جنگ ہوتی ہے۔ نتیجے سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ مٹھی بھر انسانوں نے دشمن کو شکست دی اور دشمن کے ستر آدمی قتل ہوئے' ستر یا اس سے زیادہ آدمیوں کو گرفتار کیا گیا۔

مال غنیمت کا قانون:- میں اب دوسرے پہلو کو لیتا ہوں۔ جنگ کے سلسلے میں دشمن سے چھینے ہوئے مال غنیمت کے بارے میں کیا قانون ہونا چاہیے اور دشمن کے آدمیوں سے ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' یہ ہمارے ازلی و ابدی دشمن ہیں۔ انہوں نے بلاوجہ گزشتہ پندرہ بیس سال سے اب تک ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی قطعاً کوئی توقع نہیں کہ اب وہ مسلمان ہو جائیں گے وہ ہمیں جانی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ مالی نقصان بھی پہنچا چکے ہیں' میری رائے میں ان سب کا سر قلم کر دینا چاہیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اٹھ کر فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کرنے کی بجائے فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اسلام نہ لائیں لیکن ہو سکتا ہے کہ آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں اس لئے ان کو نیست و نابود کرنے کی بجائے رہا کر دیا جائے۔ ہمیں مالی ضرورت بھی بہت ہے۔ کیوں نہ ہم ان سے فدیہ لیں جس سے ہماری مالی تقویت ہو گی اور دشمن کی مالی حالت خراب ہو گی۔ اس طرح ہم اس جنگ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول فرماتے ہیں' لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی' جس پر مومنین کو عتاب کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: **لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم** (68:8) (اگر خدا نے پہلے ہی سے فیصلہ نہ کر رکھا ہوتا تو جو چیز تم لوگوں نے لی ہے اس بنا پر تم لوگوں کو سخت عذاب دیا جاتا) کیوں؟ اس عذاب کی جو وجہ میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک پرانی شریعتوں میں ترمیم یا تنسیخ کی کوئی وحی رسول اکرمؐ تک نہ آئے وہ ان پر عمل کرنے پر مامور تھے۔ اب تک مسلمانوں کی کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی' اس لئے قانون جنگ کے متعلق کوئی احکام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ نبیوں کے احکام مثلاً توریت پر عمل کرنا رسول اکرمؐ کا فریضہ تھا۔ تورات میں صراحت سے ایک سے زیادہ

مرتبہ آیا ہے کہ اگر کوئی دشمن تمہارا مقابلہ کرے' تم سے جنگ کرے اور تمہیں اس پر غلبہ حاصل ہو تو دشمن کے مردوں' عورتوں' بچوں' بوڑھوں' جانوروں غرض ہر متنفس کو قتل کرڈالو۔ ان کا جو مال ہے وہ بھی تم لے لو اور مال کے سلسلے میں کئی مقامات پر مذکور ہے کہ وہ خدا کی چیز ہے لہٰذا اس کو جلا دو' اس سے تم استفادہ نہ کرو۔ اگرچہ رسول اکرمؐ نے اپنی فطری رافت و رحمت کے باعث بظاہر اس حکم پر عمل نہیں کیا اور خود اللہ نے بھی اپنے رسول کو "رحمتہ للعالمین" کے لقب سے پکارا ہے۔ لیکن خدا کے نزدیک یہ بات نامناسب تھی کہ جب تک قانون میں تبدیلی نہ ہو' میرا بندہ میرے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ لہٰذا تنبیہہ کی جاتی ہے: **لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم** لیکن خدا نے سزا نہیں دی۔ چونکہ خدا ہی کہتا ہے: "میں پہلے ہی سے فیصلہ کرچکا تھا کہ پرانے قانون کو بدل دوں گا۔" چنانچہ مسلمانوں نے اس جنگ سے فائدہ اٹھایا وہ یہ تھا کہ لاکھوں روپے مسلمانوں کو ملے۔ دشمن کے لاکھوں روپے خرچ ہو گئے کیونکہ فدیہ اس زمانے میں بہت گراں چیز تھی' یعنی ایک سو اونٹ۔ ایک اونٹ کی قیمت ہم چالیس درہم ہی قرار دیں جو انتہائی کم قیمت تھی اور ہر شخص کے عوض ایک سو اونٹ فدیہ میں لئے گئے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کس قدر رقم ان ستر قیدیوں سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہو گی۔ بعض لوگوں کے پاس روپیہ تھا' انہوں نے روپے دے دیئے۔ بعض لوگ تاجر تھے مثلاً ایک شخص اسلحہ بیچنے والا تھا' اس نے کہا میں اس رقم کے برابر اسلحہ تمہیں دیتا ہوں' اسے قبول کیا گیا۔ بعض لوگ خود غریب تھے لیکن ان کے دوستوں نے ان کی مدد کی اور چندہ کرکے ان کی رہائی کا انتظام کیا۔ بالآخر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بالکل غریب تھے' ان کے دوست احباب بھی مالدار نہیں تھے کہ مدد کریں' لیکن ان میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کو آپؐ حکم دیتے ہیں کہ ایک ایک سو اونٹ دینے کی بجائے تم دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاؤ۔ یہی تمہارے لئے فدیہ ہو گا' تم کو مفت رہا کردیا جائے گا۔ اس بات سے علم کی ترقی کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمناؤں اور کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں نہ تو لکھنا پڑھنا آتا تھا' نہ وہ مالدار تھے اور نہ ہی ان کے مالدار دوست تھے۔ بالآخر رسول اکرمؐ طے فرماتے ہیں کہ ان سے صرف وعدہ لیا جائے کہ آئندہ مسلمانوں سے جنگ نہ کریں گے اور اس وعدے پر ہی اعتماد کرکے انہیں مفت رہا کردیا گیا۔ ایسی بھی صورتیں پیش آئیں کہ کچھ مسلمان کسی قبیلے میں قیدی تھے۔ ان کو رہائی دلانے

کے لئے اس قبیلے کے آدمیوں کو رہا کیا گیا۔ غرض قانون جنگ کی بے شمار مثالیں اس پہلی جنگ کے دوران ہمیں نظر آتی ہیں۔ اس پر مسلمانوں کا بین الاقوامی دفاعی قانون (International Law) مبنی ہو جاتا ہے۔

غزوہ احد:- مکہ والوں کو شکست ہوئی تھی۔ وہ مکہ واپس آ گئے لیکن مطمئن نہیں ہوئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ ہمیں اتفاقاً" شکست ہوئی' لہٰذا ہمیں انتقام لینے کی تیاری کرنی چاہیے۔ اس لئے تقریباً ایک سال تک' وہ مزید کئی لاکھ روپیہ خرچ کر کے ایسے سپاہیوں کو فراہم کرتے ہیں جو اجرت پر لڑتے ہیں۔ اس غرض سے وہ مختلف قبائل میں گئے اور کہا کہ ہر شخص کو اتنی رقم دی جائے گی جو ہماری فوج میں بھرتی ہو اور جنگ کرے۔ اسے مال غنیمت بھی ملے گا۔ سال بھر کی تیاری کے بعد کفار کی فوج مکہ سے مدینہ کی طرف آتی ہے۔ اس وقت ان کی تعداد پہلے سے تین گنا ہے۔ پہلی جنگ میں اگر 950 تھی تو اب تین ہزار آدمی ان کی فوج میں پائے گئے۔ مسلمانوں کے پاس ایسے لوگ جو ہتھیار اٹھا سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار تھے اور ان میں سے تین سو آدمی آخری وقت میں دغا دے کر میدان چھوڑ گئے۔ مدینہ منورہ میں اسلام سے پہلے ایک شخص عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جس کو مدینہ والے بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ کم از کم ایک قبیلہ کے لوگ اس کے لئے ستاروں سے تاج شہریاری تیار کرنے کے لئے فرمائش بھی کر چکے تھے۔ اتنے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے آتے ہیں اور اس کی بادشاہی کا مسئلہ داخل دفتر کر کے ختم کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے دکھ ہوا ہو گا۔ وہ خوش دلی اور اخلاص کے ساتھ ہرگز مسلمان نہیں ہو سکا ہو گا۔ چنانچہ اس شخص نے جنگ احد کے موقعے پر رسول اکرمؐ سے کہا کہ مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے' مدینے سے باہر جا کر کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ابتداء میں رسول اکرمؐ کی بھی یہی رائے تھی۔ آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ بالآخر اکثریت کی رائے سے اور نوجوانوں کے اصرار پر رسول اکرمؐ نے طے فرمایا کہ ہم باہر نکل کر ہی مقابلہ کریں گے۔ اس وقت عبداللہ بن ابی بن سلول کہتا ہے کہ یہ شخص بچوں کی بات تو مانتا ہے لیکن مجھ جیسے عقل مند اور پرانے تجربہ کار کی بات نہیں مانتا' اس کا ساتھ دینا ہمارے لئے مصیبت کا باعث بنے گا۔ لہٰذا وہ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینے واپس ہو جاتا ہے۔

غرض سات سو آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے ہیں اور دشمن کی فوج تین

ہزار ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ عین موقعے پر جو مختلف حل طلب مسئلے پیدا ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کی فوج کہاں ہو' کس پہاڑی کو' کس چشمے کو' کس طرح استعمال کیا جائے' سب کی تفصیل بیان کی جائے۔ مختصراً یہ دیکھئے کہ جس مقام پر مسلمان مقیم ہوئے' وہ ایک محفوظ مقام تھا' یعنی جبل احد نامی پہاڑی کے دامن میں۔ یہ ایک کمان کی طرح ہے جس کے اندر صرف دو آدمی جا سکتے ہیں اور بہت ہی تنگ راستے سے گزر کر اس وسیع میدان کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اندرونی وسیع میدان میں مسلمان قیام کرتے ہیں اور جنگ کے لئے بیرونی دائرے کے اندر اور اس سے بھی نیچے آتے ہیں۔ دشمن ایک اور مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ مسلمان جس مقام پر لڑنے کے لئے صف بندی کرتے ہیں وہاں ایک چوٹی ہے جس کو جبل الرماۃ کہتے ہیں' یعنی تیراندازوں کی پہاڑی۔ فوجی نقطہ نظر سے وہ اہم سمجھی گئی کہ اس پار ہمارے آدمی مامور ہوں تاکہ دشمن ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کرے۔ اس کے لئے پچاس تیرانداز مامور کیے گئے۔ ایک واحد سوار جو مسلمانوں کی فوج میں تھا اور اس کا نام حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھا' ان کو مامور کیا گیا کہ تم یہیں رہو کہ اگر دشمن کی سوار فوج اس طرف سے آئے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرنا۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کے اندازے کے مطابق واقعی دشمن نے اپنی پیدل فوج کو احد کے سامنے کے میدان میں آگے بڑھایا اور اپنے سواروں کو خالد بن ولید اور ان کے قریبی رشتہ دار عکرمہ بن ابی جہل' ان دونوں کی سرداری میں جبل احد کے پیچھے سے تقریباً دس بارہ میل کا چکر کاٹ کر مسلمانوں کے پیچھے آ کر ان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے دھاوے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ دشمن بھاگنے لگا اور ان کی عورتیں بھی بھاگنے لگیں۔ عین اس وقت سوار فوج پیچھے سے پہنچ گئی۔ اس نے بھی حملہ کیا اور تیراندازوں نے یعنی مسلمانوں کی فوج کے دو سواروں نے ان کا مقابلہ کیا اور انہیں پسپا بھی کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک تنگ مقام تھا۔ خالد بن ولید پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر حملہ کرتے ہیں۔ دوسری مرتبہ پسپا ہوتے ہیں۔ اس اثناء میں دشمن کو شکست ہو چکی تھی' وہ بھاگ رہا تھا اور مسلمان سپاہی دشمن کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ اس وقت اس پہاڑی پر متعین تیرانداز سوچنے لگے کہ ہمیں اس وقت یہاں نہیں لڑنا چاہیے۔ دشمن کو شکست ہو چکی ہے۔ اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم یہاں رہیں' لہٰذا ہم بھی جائیں اور لوٹنے میں مصروف ہوں' حالانکہ ان کو رسول اکرمؐ نے انتہائی صریح اور سخت الفاظ میں تاکید کی تھی کہ اگر تم ہماری لاشوں پر گدھوں کو

بھی منڈلاتے دیکھو تب بھی اس مقام سے نہ ہٹنا۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ ان کے سردار نے تو انہیں روکا مگر باقی سپاہی نہ مانے اور پہاڑی سے چلے گئے۔ پہاڑی خالی دیکھ کر خالد بن ولید سہ بارہ حملہ کرتے ہیں۔ سردار اور ان کے ساتھ آٹھ دس آدمی شہید ہو جاتے ہیں اور کفار اس چھوٹے سے تنگ مقام سے گزر کر مسلمانوں پر ان کے پیچھے سے حملہ کر دیتے ہیں۔ جب مسلمان لوٹ رہے تھے تو سامنے دشمن کی فوج بھاگ رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ کیا بات ہے کہ ہمارا تعاقب کرنے کی بجائے وہ مڑ کر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اب وہ بھی حملہ کرتے ہیں اور مسلمان دو طرف سے دشمن فوج میں گھر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ستر مسلمان شہید ہوتے ہیں اور خود رسول اکرمؐ بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ بہت سے مسلمان بھاگتے ہیں۔ کوئی تو تین تین میل کے فاصلے پر جا رکتا ہے۔ کچھ لوگ پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو صاف الفاظ میں شکست ہو گئی۔ اس وقت کچھ خدائی تقدیر سے سابقہ پڑتا ہے۔ قریش کی فوج کے لئے فتح کے بعد مناسب یہ تھا کہ وہ فوراً مدینہ جاتی۔ وہاں کوئی حفاظتی فوج تو تھی نہیں وہ شہر مدینہ کو لوٹ لیتے اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیتے۔ اس طرح اپنی اس فتح کو مکمل کرتے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں کیا۔ شاید یہی خدا کی مشیت تھی۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دشمن فوج کا سردار یعنی ابو سفیان انتہائی فراست مند تھا۔ جس نے اونٹ کی مینگنی سے معلوم کر لیا تھا کہ مسلمان آئے ہیں۔ وہ میدان جنگ کا دورہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی لاشوں کو بھی دیکھتا ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا بھی شہید ہو گئے تھے۔ ان کا پیٹ چیر کر ان کے کلیجے یعنی جگر کو ابو سفیان کی بیوی نے چبا ڈالا تھا' اس کو بھی وہ دیکھتا ہے۔ کہتا ہے میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ گو دل میں خوش ہے کہ حضرت حمزہؓ جیسا بہادر شخص اب ختم ہو چکا ہے۔ پھر وہ ایک مقام پر جہاں دو چار مسلمان ایک پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہیں' یہ آواز دے کر چلاتا ہے: "تعریف ہو ہبل بت کی جسے فتح ہوئی اور تمہیں شکست ہوئی"۔ اس طرح وہ شیخی کے نعرے لگاتا ہے۔ شروع میں جب یہ آواز آئی تو حضرت عمرؓ نے رسول اکرمؐ سے کہا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا جواب مت دو۔ ابو سفیان چلایا: کیا ابو بکر زندہ ہے؟ کیا عمر زندہ ہے؟ جب کوئی جواب نہیں ملا تو کہا الحمد للہ سب مر چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر کہتا ہے: تعریف ہو ہبل کی۔ اس وقت حضرت عمرؓ سے رہا نہ گیا۔ رسول اکرمؐ سے پوچھے بغیر جواب دیتے ہیں: "اے اللہ کے دشمن' ہم سب زندہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں' ابو بکرؓ بھی زندہ ہیں' عمرؓ بھی زندہ ہے۔" اس وقت ابو سفیان کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ اس پہاڑی کے چھوٹے سے دستے کو جس میں مشکل سے آٹھ دس آدمی ہوں گے اوپر چڑھ کر قتل کر دینا چاہیے تھا کیونکہ ابو سفیان کے ساتھ فوج تھی' لیکن وہ کچھ نہیں کرتا۔ صرف یہ کہتا ہے کہ جنگ ایک ایسی چیز ہے کہ کل تم کو' آج ہم کو فتح ہوئی ہے۔ مجھے جو بدر میں شکست ہوئی تھی' آج میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔ میرا بیٹا حنظلہ مارا گیا تھا' آج دوسرے حنظلہ جو بہت بڑے مسلمان مجاہد تھے' ابو عامر راہب کے بیٹے تھے' نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے شہید ہو گئے ہیں۔ میں حنظلہ کے بدلے حنظلہ کو قتل کر چکا ہوں۔ آئندہ سال پھر تم سے اسی زمانے میں جنگ ہو گی۔ غرض یہ کہ ابو سفیان نے نہ جانے کس بنا پر فتح سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہا' سوائے اس کے کہ اس کی عقل ماری گئی ہو۔ اس نے کچھ نہیں کیا اور واپس ہو گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو رسول اکرمؐ اپنی عسکری فراست سے سوچتے ہیں کہ شاید مدینہ کو لوٹنے جا رہے ہیں۔ اب کیا کرنا چاہیے' کس طرح شہر کی حفاظت کی جائے۔ اولاً "ایک دو سپاہیوں کو معلوم کرنے کے لئے بھیجتے ہیں کہ یہ مکہ جا رہے ہیں یا مدینہ جا رہے ہیں۔ یہ تمہیں کس طرح معلوم ہو گا۔ یہ دیکھو کہ وہ گھوڑوں پر سوار ہیں یا گھوڑوں کو کوتل میں لے کر اونٹوں پر سوار ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہوں' تو معلوم ہو گا کہ کسی قریبی مسافت پر جا رہے ہیں اور اگر اونٹوں پر سوار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دور دراز مقام کو جا رہے ہیں۔ ان سپاہیوں نے واپس آ کر بتایا کہ وہ اونٹوں پر جا رہے ہیں اور گھوڑے کوتل میں ساتھ ہیں تو رسول اکرمؐ کو اطمینان ہوا۔ پھر شہیدوں کو دفن کرنے' زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لاتے ہیں۔ لیکن عسکری فراست سے آپؐ پھر سوچتے ہیں کہ شاید دشمن آگے جا کر پلٹ آئے۔ اس کے دفاع کے لئے انتظام کرنا ضروری ہے۔ رسول اکرمؐ اعلان فرماتے ہیں کہ جو لوگ احد کی جنگ میں شریک تھے' صرف وہی شہر سے نکلیں۔ کسی اور شخص کو فوج میں داخلے کی اجازت نہیں۔ یہ حکم کس بنا پر دیا گیا' ہمارے فوجی تجربہ کار افسر بیان کریں گے۔ شاید اس بنا پر کہ انہی لوگوں میں انتقام کا جذبہ زیادہ ہو گا۔ بہرحال رسول اکرمؐ ان سپاہیوں کو لے کر جن میں سے بہت سے زخمی بھی تھے' مدینہ کے جنوب میں تقریباً تین دن کی مسافت تک دشمن کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں' پھر قیام کرتے ہیں۔ ابو سفیان نے اب سوچا کہ ہم نے غلطی کی کہ اپنی فتح سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مدینے کی طرف واپس جائیں۔

واپس آنے لگا تو اسے بھی پتا چل گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نئی فوج لے کر ہمارے مقابلے کے لئے آ چکے ہیں۔ اسے ڈر ہوا کہ پہلے بھی لڑائی میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے تو اب کیاں کریں گے۔ لہٰذا ابو سفیان کو ہمت نہیں ہوئی کہ دوبارہ مدینہ کی طرف آئے۔ وہ مکہ واپس جاتا ہے۔ یہ دوسری لڑائی تھی۔ اس لڑائی میں دشمن کو نہ فتح ہوئی نہ شکست۔ لیکن دو پہلو قابل ذکر ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو شکست ہوئی تھی' اس کو بہتر بنانے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر تھی کہ مسلمانوں کی فوج شکست خوردہ ہو چکی ہے' اس میں دوبارہ خود اعتمادی کیسے پیدا کی جائے اور کیسے مسلمانوں کی حالت کو سدھارا اور بہتر بنایا جائے۔

غزوہ احزاب:- کوئی دو سال کے بعد مکہ والے دوبارہ مسلمانوں سے جنگ کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے انہیں ہمت ہوئی کہ مدینے پر حملہ کریں وہ یہ کہ مکہ والوں کی احد سے واپسی کے بعد مدینہ کے اندر مسلمانوں کی دو یہودی قبیلوں سے جنگیں ہوئیں۔ جن میں سے ایک بنو قینقاع او۔ دوسرے بنو نضیر تھے۔ بنو نضیر والے بہت مالدار تھے۔ جب انہیں مدینہ سے نکلنا پڑا تو خیبر جا کر بسے۔ یہ مدینہ کے شمال میں کوئی پانچ دن کی مسافت پر تھا۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر انہوں نے مسلمانوں سے انتقام لینا چاہا۔ خود مقابلہ کرنے کی بجائے کرائے کے ٹٹو جمع کر لئے۔ چنانچہ یہودیوں نے مکہ والوں سے کہا کہ تم اگر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم تمہیں پوری مدد دیں گے۔ اس طرح مکہ کے حلیف قبائل کو کہا کہ اگر تم آئندہ جنگ میں بھی مکہ والوں کا ساتھ دے کر جنگ کے لئے نکلو تو ہم بھی تمہاری مالی مدد کریں گے۔ آس پاس کے جو حلیف قبائل تھے ان کو بھی دولت کا لالچ دیا اور کہا کہ خیبر کی کھجوروں کی جو پیداوار ہو گی وہ پوری تمہیں دے دی جائے گی' بشرطیکہ تم مدینے پر حملہ کرنے میں مکہ والوں کا ساتھ دو۔ غرض یہ کہ بارہ ہزار کی فوج مدینے پر حملے کے لئے نکلتی ہے۔ مختلف وسائل سے رسول اکرمؐ کو اطلاع ہو گئی۔ میں پوری تفصیلات میں جا نہیں سکتا۔ بہرحال رسول اکرمؐ اب شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا طے فرماتے ہیں۔ مدینے والے بھی اس بار اصرار نہیں کرتے کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ لیکن روزانہ سخت سے سخت اور خطرناک سے خطرناک خبریں آ رہی تھیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فلاں فلاں دشمن قبائل بھی جنگ کے لئے آ رہے ہیں۔ بارہ ہزار کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوج کی تعداد اس وقت پندرہ سو سے

زیادہ نہیں تھی۔ دشمن کے پاس کثیر فوج کے علاوہ مالی وسائل بھی تھے۔ ان کی پشت پر خیبر کا بہت مالدار علاقہ بھی تھا۔ اس وقت مشورۃ" رسول اکرمؐ نے یہ معلوم کیا' اور یہ غالباً سلمان فارسی کا مشورہ تھا کہ جب دشمن طاقتور ہو تو ایران والے اپنے کیمپ کے اطراف خندق کھود لیتے ہیں تاکہ غفلت کی حالت میں دشمن اس کو عبور کر کے دن یا رات کسی وقت بھی ان پر چھاپہ نہ مارے۔ کہاں خندق کھودنی چاہیے؟ واقدی وغیرہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک دن گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ مدینے کے دو چار لوگوں کو ساتھ لیتے ہیں اور شہر کے اطراف کا چکر لگاتے ہیں۔ معلوم کیا کہ کس مقام پر شہر کا دفاع کمزور ہے۔ کس مقام پر ان کو قدرتی سہولتیں حاصل ہیں اور طے کیا کہ کس مقام تک خندق کھودنی چاہیے۔ پھر پوری تندہی سے سارے مسلمان سپاہی اس کام میں لگ جاتے ہیں اور رسول اکرمؐ کی انجینئرنگ وہاں کام آتی ہے۔ بتاتے ہیں کہ کس جگہ خندق کھودنی چاہیے' اور واقعہ" وہ اتنی بہتر جگہ ہے کہ آج بھی کوئی بڑے سے بڑا جنرل مدینے میں اس مقام سے بہتر کسی جگہ کا انتخاب نہیں کر سکے گا۔ وقت بہت کم ملا' اس کے باوجود دشمن کے آنے تک یہ خندق کھود لی گئی۔ یہ خندق کیسی تھی۔ کچھ تفصیلیں مجھے ملی ہیں۔ لکھا ہے کہ اتنی چوڑی تھی کہ تیزی سے دوڑنے والا گھوڑا بھی اس کو پھلانگ کر عبور نہ کر سکے اور گہرائی اس قدر تھی کہ اندر کوئی آدمی ہو تو باسانی باہر نہ آسکے۔ یعنی دو تین گز گہرائی ہوگی۔ اس انتظام سے فارغ ہوئے تھے کہ دشمن آپہنچا۔ اس کے لئے یہ نئی چیز تھی۔ مکہ والے بدوؤں کو کبھی خندق کی جنگ کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ اس مقابلے کے لئے مجبور ہوئے تھے تو اس کے سوا کہ دور سے تیر چلائیں' ان کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ خندق جس مقام پر تھی وہاں درمیان میں کچھ پہاڑوں کی چھوٹی چوٹیاں بھی ہیں جو خندق تک آتی ہیں۔ پھر تھوڑا سا حصہ خالی رہ جاتا ہے۔ پھر دوبارہ خندق شروع ہوتی ہے۔ اس طرح دو مقامات پر ایسا نظر آیا کہ وہاں خندق نہیں کھودی گئی۔ ان چوٹیوں پر مسلمان سپاہی متعین رہتے تھے۔ وہ دشمنوں کو دیکھتے تھے۔ ایک دن دشمن کا ایک سوار بڑی تیزی سے آیا اور خندق کو عبور کر کے مسلمانوں کے کیمپ میں آگیا۔ غالباً وہ کوئی ایسا ہی مقام ہو گا جہاں پہاڑ کی چوٹی اور خندق کے درمیان کا حصہ خالی تھا۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہوا' چھلانگ مار کر اندر آگیا۔ مگر وہ تن تنہا تھا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور اس کو بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کا گھوڑا پھلانگ کر عبور کرے مگر کامیاب نہیں ہوا۔ گھوڑا بھی اور وہ بھی خندق میں گر گئے۔

مسلمانوں نے اسے خندق میں ہی مار ڈالا۔ اس وقت قانون جنگ کی ایک شق اور رسول اکرمؐ کی انسانیت پروری کی ہمیں ایک نئی مثال ملتی ہے۔ وہ دشمن فوج کا بہت ہی ممتاز افسر تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیام آیا کہ اس کی لاش ہمیں واپس دے دو تو ہم تم کو خون بہا ایک سو اونٹ دینے کے لئے تیار ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' مفت لے جاؤ' مجھے اس مال کی ضرورت نہیں۔ یقیناً اس سے دشمن کے دل پر اچھا اثر پڑا ہوگا اور ہم دیکھیں گے کہ بعد میں ایسی ہی تدبیروں سے رسول اللہؐ دشمن کو نیست و نابود کرنے کی بجائے مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ خندق کی جنگ کا سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ قریش کے پاس زاد راہ ختم ہو گئی۔ انہوں نے خیبر سے کچھ چیزیں منگوائیں جو ان تک پہنچیں۔ مسلمانوں کے دستے ہر وقت چوکس رہتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اس آنے والی مدد کو روک کر چھین لیا اور قریش کو اس آخری مدد سے' جو مل رہی تھی' محروم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے قریش دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس لڑائی کو ختم کر کے واپس جائیں۔

واپسی کے اسباب:- ہمارے مورخ عام طور پر اس واپسی کی وجہ موسم کی خرابی بیان کرتے ہیں کیونکہ بہت شدید سردی ہو گئی تھی اور ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ قریش کی فوج کے ڈیرے گر پڑے تھے ان حالات میں ابو سفیان نے طے کیا کہ واپس ہونا چاہیے۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ واپسی محض موسم کی خرابی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ایک اور وجہ سے بھی تھی۔ یہ جنگ شوال میں ہوئی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے حرام مہینے (اشہر حرم) کا تصور تھا جن میں وہ جنگ کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ان میں پہلا مہینہ ذی قعد' دوسرا ذی الحجہ' تیسرا محرم اور چوتھا رجب۔ اب حرام مہینے کا آغاز ہو رہا تھا۔ شوال کی آخری تاریخ تھی۔ اب اگر ابو سفیان اور اس کی فوج وہیں رکتی تو حج کے زمانے میں مکہ آنے والے مسافروں سے جو منفعت مقامی لوگوں کو حاصل ہوتی تھی (جو آج بھی ہوتی ہے) وہ لوگ اس سے محروم ہو جاتے۔ دوسرے یہ توہمات (Superstitions) بھی تھے کہ حرام مہینوں میں جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ موسم کی خرابی کے علاوہ یہ دونوں وجوہ زیادہ موثر ہوں گے۔ بہر حال آخری دنوں میں قریشیوں نے ایک تدبیر اور سوچی اور اس کا غالباً انہیں خیبر کے یہودیوں سے مشورہ ملا۔ جب خیبر کے یہودیوں کو معلوم ہوا کہ بارہ ہزار کی فوج کے باوجود ایک مہینے میں قریش کامیاب نہیں ہو رہے ہیں تو ان کا سردار مدینہ آیا۔ چھپ کر

صورت حال معلوم کی اور دیکھا کہ ایک صورت مسلمانوں کو شکست دینے کی ممکن ہے۔ وہ یہ کہ مدینے کے اندر ابھی یہودیوں کا ایک قبیلہ بنو قریظہ رہتا تھا۔ مسلمان اس کی طرف سے مطمئن ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کریں اور یہ عین اس وقت ہو جب سامنے سے قریش اور ان کے ساتھی جنگ کر رہے ہوں۔ اس طرح مسلمان دو دشمنوں میں گھر جائیں گے اور انہیں شکست ہو جائے گی۔ بنو نضیر کا یہ سردار بن قریظہ کے پاس جا کر ان کو آمادہ کرتا ہے کہ تم جنگ کرو۔ اس کی اطلاع رسول اکرمؐ کو ہو گئی۔ اس وقت آپؐ نے اپنی عسکری ذہانت اور سیاسی فراست سے اس سازش کو توڑنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک شخص کا انتخاب کیا گیا جو اب تک غیر مسلم جانا جاتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ وہ مشرکین عرب میں سے ہے۔ وہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اور ابھی اس کے ایمان لانے کی خبر نہیں پھیلی تھی۔ اس کو رسول اکرمؐ نے ایک سیاسی مشن پر مامور کیا۔ چنانچہ وہ پہلے بنو قریظہ کے ہاں جاتا ہے اور ان سے کہتا ہے "اگر قریش کے لوگ تم سے مطالبہ کریں کہ تم بھی حملہ کرو تو اس کا اطمینان کر لو کہ اس لڑائی کے بعد قریش تمہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے' کیونکہ اگر مکہ والے واپس ہو گئے تو تم تن تنہا رہ جاؤ گے' پھر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تنہا رہ کر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے قریش نہیں جائیں گے۔ تم ان سے کچھ یرغمال کا مطالبہ کرو کہ چند آدمی اپنے سرداروں میں سے ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہمیں اطمینان رہے کہ تم آخری وقت میں ہمیں دغا دے کر نہیں چلے جاؤ گے۔" انہوں نے کہا "بات تو تم ٹھیک کہتے ہو" پھر وہ شخص قریش کے کیمپ میں جاتا ہے اور کہتا ہے تمہیں خوب معلوم ہے کہ میں تمہارا دوست فلاں ہوں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بنو قریظہ کے یہودیوں میں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ساز باز ہو گئی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ قریش سرداروں کو حاصل کریں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سپرد کر دیں۔ ایک شخص ڈرتا ہوا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے کہ فلاں شخص یہ کہہ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی (Diplomatic) انداز میں جواب دیا **لعلنا امرنا ہم بذالک** (شاید ہم نے انہیں ایسا حکم دیا ہو) بنو نضیر کا وہاں ایک جاسوس موجود تھا' وہ دوڑا ہوا جاتا ہے اور ابو سفیان کو اطلاع دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی ابھی کہا کہ شاید ہمیں نے بنو قریظہ کو ایسا حکم دیا ہو۔ اس طرح آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ جب قریش کا وفد بنو قریظہ کے پاس پہنچا تو اس نے دو مطالبے کئے۔ ایک تو یہ کہ اپنے یرغمال ہمیں دو' دوسرا یہ کہ سنیچر کے دن

جنگ نہ ہو' کیونکہ سنیچر کے دن یہودی مذہب میں جنگ کرنا حرام ہے۔ غرض یہ کہ دونوں میں پھوٹ پڑ گئی' اور اس طرح سیاسی ذرائع سے اس حملے کا سدباب کر لیا گیا جو مسلمانوں پر آخری دن مدینہ کے جنوب سے بھی اور شمال سے بھی ہونے والا تھا۔ اس طرح قریش کی فوج اور ان کے ساتھی ناکام ہو کر مدینے سے واپس جاتے ہیں اس وقت رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ یہ قریش کی آخری کوشش تھی۔ اب آئندہ ابتدا و اقدام (Initiative) ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم ہی فیصلہ کیا کریں گے کہ کب جنگ شروع ہو اور کب ختم ہو۔

غذائی قلت:- مکہ والے ابتدائی دو شکستوں کے بعد یہودیوں اور دیگر لوگوں کی ترغیب پر دوبار مدینے پر حملہ آور ہوئے۔ جنگ خندق میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ محاصرہ اٹھا کر واپس ہو گئے۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش بینی فرمائی' جیسا کہ حدیث میں صراحت سے ذکر ہے کہ اب دشمن ابتداء (Initiative) نہیں لے گا بلکہ (Initiative) لیں گے۔ اس کے کیا معنی تھے؟ رسول اکرمؐ نے خیال فرمایا کہ اب مکہ والوں کو جرات نہیں ہوگی کہ پھر مدینے پر حملہ کریں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس وقت وہ تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں جن کا تعلق براہ راست فوج اور جنگ سے نہیں ہے لیکن ان کا اثر فوجی کاروائیوں پر پڑتا ہے۔ اسی زمانے میں ایک قحط عرب میں نمودار ہوا جس سے مکہ والے بے انتہا متاثر ہوئے مکہ میں چونکہ زراعت نہیں ہوتی' انہیں غلہ باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ جن مقامات سے غلہ درآمد ہوتا تھا وہاں بھی قحط کے آثار نمایاں تھے اور وہ بھی ان کو غلہ مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس کا اثر فوجی نقطہ نظر سے پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں نجد واحد علاقہ تھا جہاں کی پیداوار قحط سالی سے بچ گئی تھی اور وہاں سے غلہ مکے کو برآمد ہو سکتا تھا۔ ایک دن مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ کسی مقام پر تھا۔ انہوں نے ایک شخص' ثمامہ بن اثال' کو مشتبہ حالت میں دیکھ کر گرفتار کر لیا اور اسے مدینہ لے آئے۔ اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً" پہچانتے تھے۔ وہ نجد کا ایک بہت بڑا سردار تھا اور ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے بھی آیا تھا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت اس کو بھی تبلیغ اسلام کی تھی۔ تو اس نے دھمکی دی تھی "اے محمد! چپ رہ' ورنہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔" اب وہی شخص گرفتار ہو کر مدینے لا گیا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے کہتے ہیں "کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تو اپنی بے دینی اور بت پرستی چھوڑ کر اپنے بنانے والے اللہ کی

عبادت کرے۔" اس نے کہا: "اے محمد! اگر تجھے مزید کے مال کی ضرورت ہے تو جتنا مال کہے' میں دینے کو تیار ہوں' میں مالدار ہوں۔ اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو میں ذودم ہوں۔" (یہ ایک عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں خون والا) بظاہر اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ میں قتل کئے جانے کا مستحق ہوں۔ میں خون بہا ادا کر چکا ہوں غالباً اس نے کسی مسلمان کو قتل کیا تھا۔ پہلا جواب اس کا یہی تھا کہ جتنا فدیہ مانگتے ہو میں دینے کو تیار ہوں۔ اس پر گفتگو ختم ہو جاتی ہے اور رسول اکرمؐ حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کو مسجد میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دو تاکہ یہ دن بھر ہماری عام زندگی کو دیکھے اور ہماری نمازوں کا مشاہدہ کرے۔ اسے کھلایا پلایا بھی جاتا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ وہ ایک آدمی دس آدمیوں کے برابر خوراک کھاتا تھا مگر اسے پورا کھانا دیا جاتا تھا۔ اسے انسانی ضرورتوں کے لئے یقیناً کھولا جاتا ہو گا۔ پھر واپس لاکر اسے باندھ دیتے تھے۔ پھر ہر نماز کے وقت رسول اکرمؐ اس کے پاس سے گذرتے اور کہتے کہ اسلام لاؤ۔ وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ "اگر فدیہ مانگتے ہو تو مانگو۔ جتنا کہو میں دینے کو تیار ہوں۔ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو میں خون والا شخص ہوں۔" کئی دن اسی طرح گذر گئے۔ آخر اس طرح کے جواب بیسیوں بار سن کر رسول اکرمؐ اسے فرماتے ہیں۔ "جاؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔" یہ اس کے لئے غیر متوقع چیز تھی وہ اس لطف اور مہربانی سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ مسجد سے نکلتا ہے' قریب ہی ایک کنوئیں پر جا کے غسل کرتا ہے اور واپس مسجد میں آکر رسول اکرمؐ کے سامنے کہتا ہے: **اشهدان لا اله الا الله واشهدان محمدالرسول الله** اور اس جملے کا بھی اضافہ کرتا ہے۔ "اب سے چند منٹ پہلے تک دنیا کا وہ شخص' جس سے میں سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا' تم تھے۔ لیکن اب دنیا کا وہ شخص جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں وہ آپؐ ہیں۔" اس کے بعد اس نے فوجی نقطہ نظر سے جو خاص بات کہی' وہ یہ تھی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ملک سے مکہ والوں کو غلہ برآمد کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم اب جب تک آپؐ مجھے اس کا حکم نہیں دیں گے اس وقت تک ایک دانہ بھی غلے کا نجد سے مکہ نہیں بھیجا جائے گا۔" غلے کی بندش سے مکہ کی معاشی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ آخر مکہ والے مجبور ہو گئے۔ ذلت کا احساس لئے ادب کے ساتھ مدینہ کو ایک وفد بھیجتے ہیں اور التجا کرتے ہیں "اے محمد! تم ہمیشہ نیکی' مہربانی اور محبت کی تعلیم دیتے رہے ہو۔ اب اپنے ہم شہریوں اور ہم وطنوں پر رحم کرو۔ ہم بھوک سے مرے جا رہے ہیں۔" رسول اکرمؐ فوراً ثمامہ بن اثال کو ایک خط بھجواتے ہیں کہ غلہ بھیجنے کی بندش اٹھالی

جائے۔ اس کا مکہ والوں کے دل پر اثر ہونا چاہیے تھا اور یہی رسول اکرمؐ کا مقصد تھا کہ ان کو اسلام کی طرف مائل کریں۔ اس کے بعد اس پر ہی صرف اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ مدینہ سے پانچ سو اشرفیاں، جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی، مکے کے فقراء غرباء کی امداد کے لئے بھیجتے ہیں۔ قحط کے زمانے میں ہر شے کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ غریب لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا کہ کسی چیز کو خرید سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچسو اشرفیاں مکہ کے سردار! ابو سفیان کو بھیجتے ہیں کہ یہ غرباء کی امداد کے لئے بھیج رہا ہوں۔ وہ بھناتا ہے۔ اس کے الفاظ جو تاریخ میں مرقوم ہیں: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو ورغلائے۔" بہرحال اس کو حالات اجازت نہیں دیتے کہ رقم واپس کرے۔ اس کے بعد اور بھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کا مجموعی اثر مکہ والوں پر یہ پڑا کہ وہ اسلام کو اور پیغمبر اسلام کو دشمن سمجھنے کی بجائے دل ہی دل میں اس پر فخر کرنے لگے کہ انہی کے شہر کا آدمی اب بادشاہ بن رہا ہے اور طاقتور ہوتا جا رہا ہے مگر اس کے اظہار کی ان میں جرات نہیں تھی۔ یہ اسلام کی طرف میلان کی فطری اور اندرونی کیفیت تھی۔ اس طرح اب اگر مکہ والوں پر مسلمان حملہ کریں تو بھرپور مقابلے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مکہ والے کیوں ان کا مقابلہ کریں، جبکہ وہ تو مصیبت کے وقت ان کی مدد کرتے ہیں۔ وہ ان سے کیوں جنگ کریں گے۔

بیعت رضوان:- ان حالات میں رسول اکرمؐ اپنی عادت کے برخلاف کہ جب کبھی کسی مقام پر جنگ کے لئے جاتے تو اسے مخفی رکھتے کہ دشمن کو پتہ نہ چلے، لیکن اب کھلم کھلا اعلان فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع بھجواتے ہیں کہ میں مکہ جا رہا ہوں، البتہ حج کو نہیں، عمرے کے لئے۔ حج سے ایک مہینہ پہلے وہاں جاؤں گا، تاکہ کوئی اور دشواریاں وہاں پیدا نہ ہوں۔ راستے میں اطلاع ملی کہ قریش کا ایک حلیف قبیلہ احابیش جنگ کی تیاری کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ مکے جا کر مکے والوں کا ساتھ دے اور اگر رسول اکرمؐ مکے پر حملہ کریں تو وہ اپنے حلیفوں کی مدد کرے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوجی مشاورتی کمیٹی طلب فرماتے ہیں۔ اس کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پہلے اس قبیلے پر حملہ کریں۔ اسے لوٹیں اور اسے شکست دے کر نیست و نابود کر دیں، تاکہ دشمن اس کی مدد حاصل نہ کر سکے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم حج کا اعلان کر چکے ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم جنگ نہ کریں۔ خدا ہماری مدد کرے گا۔ اس رائے کو رسول اکرمؐ قبول فرماتے ہیں اور مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ مکہ کی جغرافیائی صورت حال یہ ہے کہ جدہ سے تھوڑی دور تک

کھلے میدان میں اس کے بعد مکہ سے آگے تک بلند پہاڑ، تنگ درے اور پہاڑوں کے درمیان راستے پائے جاتے ہیں۔ جس مقام پر اہم قدرتی دشواریاں شروع ہو رہی تھیں اس مقام کا نام حدیبیہ ہے۔ اسے آج کل "شمیسی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسلمان حدیبیہ پہنچے ہیں۔

اس ضمن میں ایک چھوٹی سی چیز فوجی نقطہ نظر سے دلچسپ ہے جب مدینہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو عمرہ کرنے کا مقصد واضح تھا۔ سپاہیوں سے کہا کہ ساتھ ہتھیار نہ لیں سوائے اس ہتھیار کے جسے حالت امن میں ہر شخص اپنے ساتھ رکھتا ہے، یعنی ایک تلوار۔ وہ جنگ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف حفاظتی تدبیر کے طور پر رکھی جاتی ہے۔ لیکن تھوڑی دور پہنچنے کے بعد رسول اکرمؐ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ ہم دشمن کے ملک میں جا رہے ہیں۔ ہم جنگ کا آغاز نہیں کریں گے لیکن اگر دشمن آغاز کرے تو کیا ہو گا؟ آخر مشورے کے بعد طے پایا کہ مدینے سے فوجی ساز و سامان کا ذخیرہ منگوا لیا جائے جو فوج کے ہمراہ بند رہے۔ ضرورت پر اس سے کام لیا جائے گا۔ ورنہ وہ بند ہی رہے گا۔

بہرحال حدیبیہ پہنچتے ہیں اور اپنا ایک سفیر مکہ بھیجتے ہیں تاکہ مکہ والوں کو اطمینان دلائے کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے بلکہ صرف عمرہ کے لئے، تمہاری عبادت گاہ کی زیارت کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس وقت تک کعبہ پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں تھا، بلکہ وہ بت پرستی کا مرکز تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس مقصد کے لئے بھیجے گئے۔ اولاً رسول اکرمؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجنا چاہا کیونکہ مکہ کی شہری مملکت کا دستور تھا کہ ہر کام کے لئے عہدیدار تھا اور حضرت عمرؓ مکہ میں سفارت کے کام انجام دینے والے یعنی وزیر خارجہ تھے۔ رسول اکرمؐ کا خیال تھا کہ مکہ کے جو وزیر مسلمان ہو چکے ہیں ان کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا جائے۔ اس لحاظ سے حضرت عمرؓ اسلامی حکومت کے وزیر خارجہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ وزیر خارجہ کو بطور سفیر کے مکہ سے گفت و شنید کے لئے بھیجا جائے۔ حضرت عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ مکہ والے میری جان کے دشمن ہیں اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ میرے جاتے ہی وہ مجھے جان سے مار دیں۔ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں ان کا سب سے سخت دشمن رہا ہوں۔ حضرت عثمانؓ کو بھیجا جائے کیونکہ بنی امیہ کے لوگ اب تک مکہ ہی میں ہیں۔ حضرت عثمانؓ بنی امیہ کے آدمی ہیں۔ غالباً ان کے ساتھ وہ نسبتہً نرم سلوک کریں گے۔ یہ رائے حضور اکرمؐ کو پسند آتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کو بھیجتے ہیں لیکن

انہیں وہاں قید کر دیا جاتا ہے اور خبر پھیلتی ہے کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع مسلمانوں کے کیمپ میں آتی ہے تو رسول اکرمؐ اس وقت مجبور ہو کر جنگ کا انتظام فرماتے ہیں اور سارے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ آئے تو ہم عمرہ کے لئے تھے' لیکن دشمن نے ہمارے سفیر کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا انتقام لینے کے لئے ہمیں جنگ کرنی پڑے گی۔ لہذا بیعت کرو کہ جان کے نکلنے تک اور آخری قطرہ خون جسم میں رہنے تک ہم دشمن سے جنگ کریں گے۔ یہ "بیعت رضوان" ہے۔ جس درخت کے نیچے رسول اکرمؐ نے سب لوگوں سے بیعت لی تھی' وہ درخت اتنا مقدس ہو گیا کہ قرآن میں بھی اس کا ذکر آیا ہے اذ یبایعونک تحت الشجرۃ (18:48)

یہاں ایک بات ضمناً عرض کرتا ہوں۔ رسول اکرمؐ کے بعد مسلمانوں میں وہ درخت بے حد مقدس بن گیا۔ اکثر لوگ بیمار ہوتے تو وہاں جاتے' اس درخت کے سائے میں بیٹھتے اور تندرست ہو جاتے' کم از کم مشہور یہی ہوا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بے شمار لوگ اس درخت کی تقریباً پوجا کرنے لگے۔ حضرت عمرؓ کا زمانہ آتا ہے تو وہ درخت کٹوا کر غائب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے نہ کہ اس کی بنائی مخلوق' ایک درخت سے' چاہے وہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو۔ یہ تھی اسلامی توحید پرستی کہ رسول اکرمؐ کے آثار مبارکہ سے بھی اگر اسلام کے اس بنیادی عقیدے کی خلاف ورزی ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے تو اسے دور کر دیا جاتا ہے۔

صلح حدیبیہ:- بہرحال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارے مسلمانوں سے' جو فوج میں تھے بیعت لیتے ہیں کہ ہم دشمن سے جنگ کریں گے۔ اس کی اطلاع اہل مکہ کو ہوتی ہے تو وہ گھبراتے ہیں۔ پہلے ایک شخص کو بھیجتے ہیں جو مکہ والوں کا حلیف تھا۔ وہ مکہ والوں کی طرف سے بطور سفیر کے مسلمانوں کے کیمپ میں آیا۔ ایک اجڈ بدوی ہونے کے باوجود وہ عقل مند تھا۔ چنانچہ رسول اکرمؐ نے اپنی فوج کے لوگوں کو حکم دیا کہ اس شخص کو وہ جانور دکھاؤ جو ہم قربانی کے لئے ساتھ لائے ہیں تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ ہم جنگ کے لئے نہیں آئے' بلکہ ایک پرامن مقصد یعنی عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ اس زمانے میں قربانی کے جانوروں کو مختلف ذرائع سے نمایاں کیا جاتا تھا۔ مثلاً ان کے گلے میں جوتیوں وغیرہ کا ہار ڈالتے تھے۔ ان کے کانوں کو کچھ زخمی کر دیتے تھے۔ جس سے خون بہتا ہو۔ اس وقت تک یہ رواج مسلمانوں میں بھی تھا۔ ایسے جانور جب اس شخص نے دیکھے تو بغیر کسی مزید گفتگو کے واپس جاتا ہے اور مکہ والوں سے کہتا ہے کہ مسلمانوں سے

جنگ نہ کرو، ورنہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا، کیونکہ وہ صرف عمرہ کے لئے آئے ہیں اس دھمکی کا بھی اثر پڑا۔ بالآخر مکہ والے ایک اور شخص کو روانہ کرتے ہیں جو رسول اکرمؐ کا برادر نسبتی ہے، رسول اکرمؐ کی بیوی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا چچازاد بھائی۔ وہ ایک عقلمند اور سنجیدہ شخص تھا، وہ گفت و شنید کرتا ہے۔ بالآخر صلح کی شرطیں طے ہو جاتی ہیں۔ وہ شرطیں مسلمانوں کے بظاہر خلاف تھیں۔ مثلاً یہ کہا گیا تھا کہ آئندہ دس سال تک صلح کی حالت رہے گی۔ اس اثناء میں اگر کوئی مدینے کا مسلمان اپنا شہر چھوڑ کر مکہ آئے تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی مدینے کا مسلمان اپنا شہر چھوڑ کر مکی شخص رسول اکرمؐ کے پاس جائے اور ہم مطالبہ کریں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے واپس کریں۔ اس طرح کی کچھ شرائط تھیں جو بظاہر مسلمانوں کے لئے توہین آمیز اور ان کی کمزوری دکھانے والی تھیں۔ اس کے باوجود رسول اکرمؐ انہیں قبول کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کا قول یہ تھا کہ میں اس وقت صلح کی غرض سے آیا ہوں۔ اس کے لئے مکہ والے مجھ سے جو بھی مانگیں گے وہ دینے کے لئے تیار ہوں، ہمارے مشہور فقیہ شمس الائمہ سرخسی اپنی دو کتابوں میں ایک ایسی چیز کا ذکر کرتے ہیں جو میں نے سیرت النبیؐ کی کتابوں میں نہیں پڑھی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جغرافیہ پر نظر ڈالو، خیبر مدینے کے شمال میں ہے، مکہ مدینے کے جنوب میں۔ مدینہ دو دشمنوں کے درمیان ہے۔ خیبر سے بھی مسلمانوں کی جنگ ہے، مکہ سے بھی مسلمانوں کی جنگ ہے اور خیبر و مکہ میں معاہدہ ہے کہ اگر مسلمان ایک فریق کی طرف بڑھیں تو دوسرا فریق مدینے پر حملہ کرے۔ اگر رسول اکرمؐ خیبر کو جاتے ہیں تو اہل مکہ مدینہ پر چڑھ دوڑیں گے، اسے لوٹ لیں گے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف جاتے ہیں تو خیبر والے مدینے کو کھلا پا کر اس پر حملہ کریں گے۔ ان حالات میں ایک فریس سیاستدان اور ایک صاحب فراست کمانڈر کی حیثیت سے رسول اکرمؐ نے طے فرمایا کہ دونوں میں سے ایک فریق سے صلح کر لی جائے اور اس کو اپنے ساتھی سے الگ کر دیا جائے۔ جب ایک فریق تنہا ہو جائے گا تو اس سے ہم نبٹ سکیں گے۔ ان حالات میں آپ یہ طے کر کے تشریف لاتے ہیں کہ فریق مخالف جو شرائط بھی کہتا ہے ہم منظور کریں گے۔ یہاں انتخاب کا سوال ہے۔ کیا خیبر والوں سے صلح کریں یا مکہ والوں سے؟ خیبر والوں سے صلح کا کوئی امکان نہیں۔ بنی نضیر کے یہودیوں کو مدینے سے نکالا گیا تھا۔ ان کی اولین شرط یہ ہوتی کہ انہیں مدینے آنے دیا جائے۔ وہ مالدار تھے۔ انہیں کچھ رقم پیش کی جاتی تو ان کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔

اس کے برخلاف مکہ والے، حضور اکرمؐ اور مہاجرین کے قریبی رشتہ دار تھے۔ کوئی کسی کا بھائی، کوئی بھتیجا، کوئی چچا، غرضیکہ سب ان کے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا ان رشتہ داروں کو بچانا زیادہ مناسب تھا، بہ نسبت اس کے کہ یہودیوں کو بچا کر مکہ والوں پر حملہ کرتے اور انہیں ختم کر دیتے۔ علاوہ ازیں مکہ والے پہلے کی تین جنگوں بدر، احد اور خندق میں شکست کھا کر مجبور ہو چکے تھے۔ ان کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ تجارت کی کساد بازاری تھی۔ لہٰذا وہ آسانی کے ساتھ مسلمانوں سے صلح کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ان مختلف وجوہ سے مکہ والے مسلمانوں سے صلح کرنے کے لئے دل سے آمادہ تھے۔ رسول اکرمؐ کی یہ بھی کوشش رہی تھی کہ قحط کے زمانے میں مکے والوں کا دل موہ لیا جائے ان سب وجوہ سے انہوں نے ایک شرط تو اپنی بڑائی دکھانے کے لئے لگائی تاکہ دنیا سے کہہ سکیں کہ ہم نے دب کر صلح نہیں کی، باقی سب شرطیں قبول کر لیں۔ ان شرائط کا مطالعہ کریں تو ان میں ایک شرط نظر آتی ہے جو آدھی سطر میں ہے۔ **لا اسلال و لا اغلال** اس کے کیا معنی ہیں۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ نہ ہتھیار کو اس کے میان سے نکالا جائے گا، نہ دھوکے بازی کی جائے گی۔ مطلب یہ تھا کہ اہل مکہ اور مسلمان اب وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے پر حملہ اور جنگ نہیں کریں گے اور چھپ کر بھی اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں مکہ والوں کا یہ وعدہ بھی تھا کہ اگر مسلمانوں کی جنگ کسی تیسرے فریق سے ہو تو وہ غیر جانبدار رہیں گے۔ مسلمانوں کے خلاف غداری و دغا بازی نہیں کریں گے۔ اس شرط پر آپ ساری شرائط کو قبول کرتے ہیں، یہ بھی کہ دس سال تک ان میں صلح رہے گی، یہ بھی کہ مکہ کے تجارتی قافلے مدینے سے گزر سکیں گے۔ ان کی ساری شرائط قبول کی جاتی ہیں، صرف اس شرط پر کہ وہ آئندہ جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے۔ یہ شرطیں طے ہو گئیں۔ رسول اکرمؐ نے بجائے مکہ جانے کے دل شکستہ مسلمانوں کو حکم دیا کہ ہم حدیبیہ میں ہی اپنا عمرہ کر لیں۔ وہ روئے دھوئے مگر رسول اکرمؐ کا حکم تھا۔ بہرحال وہ اس کو انجام دیتے ہیں اور پھر مدینہ واپس ہو جاتے ہیں۔ مدینہ پہنچنے کے دو ہفتے بعد خیبر پر حملہ کیا جاتا ہے اور خیبر پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ گویا دو دشمنوں میں سے ایک مغلوب ہو جاتا ہے۔ فتح خیبر کے سلسلے میں یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی فوج میں چودہ سو سپاہی تھے اور ہمارے مورخوں کے بیان کے مطابق خیبر میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے۔ چودہ سو نے بیس ہزار سے مقابلہ کیا اور ان کے علاقے پر دو چار دن میں قبضہ کر لیا۔ اس طرح اس خطرے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

خلاف ورزی:- مکہ والوں سے حدیبیہ میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ان دو فریقوں کے علاوہ جو فریق چاہے معاہدے میں ذیلی طور پر شریک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جس قبیلے کا ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا گیا کہ وہ مکہ والوں کا حلیف تھا' اس نے کہا کہ ہم مکہ والوں کی طرف سے انہی شرائط پر اس معاہدے میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک اور قبیلہ قضاعہ تھا' اس نے کہا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس معاہدہ صلح میں شریک ہوتے ہیں۔ ان دونوں قبیلوں کی آپس میں لڑائی تھی۔ شروع میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ لیکن ایک دن کہتے ہیں کہ قبیلہ قضاعہ اور بنو کنانہ میں ایک بات پر جھگڑا ہو گیا۔ کسی شخص نے رسول اکرمؐ کو گالی دی اسے قبیلہ قضاعہ کے لوگ برداشت نہ کر سکے اور اس شخص کو قتل کر دیا۔ اس قتل کے جواب میں ان لوگوں پر حملہ کیا گیا اور ان کے دو چار آدمی قتل کئے گئے۔ اس طرح یہ واقعہ مقامی واقعہ بن کر رہ جاتا ہے اگر ایک دوسرا واقعہ پیش نہ آتا: مکہ والوں کو اطلاع ملی کہ بنو کنانہ جو ان کے حلیف ہیں' ان میں اور قضاعہ میں جو مسلمانوں کے حلیف ہیں جنگ چھڑ گئی ہے' تو وہ چھپ کر آتے ہیں بھیس بدل کر اور نقاب ڈال کر آتے ہیں اور قضاعہ والوں پر حملہ کر کے قتل و غارت گری کرتے ہیں۔ اس کی جو اطلاع قضاعہ والے مدینہ پہنچاتے ہیں اس کا ایک لفظ دلچسپ ہے کہ جس وقت ہم سجدہ اور رکوع کی حالت میں تھے ان لوگوں نے ہم پر حملہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قضاعہ میں بہت سارے مسلمان تھے۔ مسلمانوں کا ہاتھ کھل گیا تھا۔ اب وہ مکہ والوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ لیکن رسول اکرمؐ یہ نہیں چاہتے تھے کہ پھر جنگ کریں۔ قضاعہ کے وفد سے آپؐ فرماتے ہیں: "دیکھو یہ سامنے بادل جا رہا ہے۔ اس کی گڑگڑاہٹ تم نے ابھی سنی۔ وہ تمہاری فتح کی خبر سنا رہا ہے۔" ایک بہت ہی خاص انداز میں ان کی دلجوئی بھی کرتے ہیں کہ تمہیں فتح ہو گی اور کوئی چیز نہیں بتاتے کہ کیا ہو گا۔ وفد خوش اور مطمئن ہو کر واپس جاتا ہے۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ جلد ہی مسلمان مکہ والوں پر حملہ کریں گے۔ مدینہ میں رسول اکرمؐ ان سارے مقامات پر جو راستے میں تھے' جہاں سے لوگ گزرتے تھے وہاں چوکیاں قائم کرتے ہیں تاکہ کوئی شخص باہر کا نہ اندر آئے اور نہ اندر کا باہر جائے۔ ناکہ بندی اتنی مکمل تھی کہ دو واقعات ایسے بھی پیش آئے کہ لوگوں نے چھپ کر جانے کی کوشش کی تو گرفتار ہو گئے۔ اس سے یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ مدینہ کی تیاریوں کی اطلاع مکہ والوں تک نہ پہنچا دیں۔ دوسری چیز رسول اکرمؐ نے مدینے میں یہ کی لوگوں سے کہا کہ ایک بڑی مہم درپیش ہے' اس کے لئے تیاریاں کرو' کہا جاتا ہے کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں

تھا۔ اس رازداری کی حد یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آتے ہیں اور اپنی بیٹی حضرت عائشہ سے پوچھتے ہیں۔ "بیٹی' تیاری تو بڑی جنگ کی ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں جانے والے ہیں؟" وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ کہتی ہیں: "ابا جان' مجھے نہیں معلوم۔ ممکن ہے شام کو جا رہے ہوں' ممکن ہے یمن کو جا رہے ہوں' کچھ معلوم نہیں۔" مگر حضرت ابو بکرؓ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد تھا۔ اتنے میں آپؐ تشریف لاتے ہیں اور گفتگو کے الفاظ سن کر کہتے ہیں: "مکہ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن اسے راز میں رکھنا" اس کے بعد ایک تدبیر اختیار کرتے ہیں' جس کے بارے میں فوجی ماہرین ہی بتائیں گے کہ وہ کتنی موثر اور کتنی اہم تدبیر تھی۔

مسلمانوں کے بہت سے حلیف تھے۔ جنگ کے موقعہ پر حلیف کی جماعت جو رضاکاروں پر مشتمل ہوتی تھی' بھیجتا تھا۔ عام طور پر وہ لوگ مدینے آتے اور مدینے سے ساری اسلامی فوج' مدینے کے سپاہی بھی اور باہر سے آئے ہوئے مسلمان قبائل کے سپاہی بھی' منزل مقصود کو روانہ ہوتے تھے۔ اس دفعہ یہ نہیں کیا گیا۔ رازداری سے حلیف قبائل کو ایک اطلاع بھیجی گئی کہ تمہارا سردار مدینے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ آتے ہیں۔ ہر ایک سے فرداً فرداً' علیحدہ رازداری سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ انہیں یہ نہیں بتاتے کہ کہاں کے لئے تیار ہونا ہے۔ بس اس طرح تیار رہنے کا حکم دیتے ہیں کہ ایک منٹ کے نوٹس پر تم ہمارے ساتھ چل پڑو۔ مدینہ نہ آنا' ہم تمہارے علاقے سے گزریں گے تو تمہاری فوج کو اپنے ساتھ لے لیں گے۔

بہت سے لوگ تیار تھے اور کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ رسول اکرمؐ کہاں جا رہے ہیں۔ ایک بہت بڑے صحابی شاید حذیفہ بن یمان ہیں۔ ان کی حدیث بخاری میں ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نکلتے ہیں۔ تو مکہ جو جنوب میں ہے' اس طرف نہیں جاتے بلکہ شمال کی طرف جاتے ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ شاید باز نطائن سے جنگ کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ وہاں کے قبیلے کے لوگوں کو لے کر شمال مشرق کو جاتے ہیں۔ پھر جنوب مشرق کو۔ اس طرح Zigzag سفر کرتے ہیں کہ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ صحابی کہتے ہیں کہ مکہ کی پہاڑیوں کے دامن میں جو آخری قیام تھا وہاں پہنچنے تک ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

فتح مکہ:۔ مسلمانوں کی دس ہزار فوج اس زمانے کے لحاظ سے ایک عظیم الشان تعداد تھی جو چھپ کر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کی اطلاع مکہ والوں کو نہیں ہوتی۔ جب عام طور پر مسلمان سفر کرتے تو سپاہیوں کو حکم ہوتا ہے کہ ملکر آگ جلائیں۔ اس دن حکم دیا جاتا ہے کہ مشترکہ چولہے نہ جلائیں۔ چار چار پانچ پانچ سپاہی مل کر غذا تیار کرنے کی بجائے الگ الگ آگ جلائیں۔ اس طرح دس ہزار فوج میں دو ہزار چولہوں کی بجائے دس ہزار چولہے جلتے ہیں۔ ابو سفیان مکہ کا سردار ہے۔ وہ توقع کر رہا ہے کہ مسلمان حملہ کریں گے۔ اس کے دل میں چور ہے چونکہ وہ حملہ کر چکا ہے۔ وہ روزانہ رات کو شہر مکہ کی پہاڑی پر چڑھ کر ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہے کہ دشمن اگر آ رہا ہو تو دور ہی سے اس کی اطلاع ہو جائے اس نے دیکھا کہ دس ہزار چولہے جل رہے ہیں یعنی لگ بھگ پچاس ہزار فوج آئی ہوئی ہے۔ وہ پہاڑی سے کیمپ کی طرف اترتا ہے۔ چوری سے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا ہے کہ اتفاقاً کوئی شخص مل جائے جو بتائے کہ یہ کون ہیں۔ مسلمانوں کی فوج کا قاعدہ تھا کہ قیام کرنے کے بعد کچھ سپاہی گشت کرتے تھے کہ اگر کوئی دشمن چھپ کر حملہ کر رہا ہو تو اس کا سدباب کیا جا سکے۔ ایک پٹرول کے ہاتھ ابو سفیان گرفتار ہوتا ہے۔ وہ شہر مکہ کا بادشاہ اور سپہ سالار ہے۔ مکہ والوں کو کوئی اطلاع نہیں ہے کہ دشمن آیا ہے۔ اسے گرفتار کر کے رسول اکرمؐ نے یہ حکم دیا کہ اس کو بہت اچھے برتاؤ کے ساتھ اپنے پاس رکھو، لیکن جانے نہ دو، بلکہ اس کی حفاظت کرو۔ صبح رسول اکرمؐ حکم دیتے ہیں کہ فوج شہر میں داخل ہو جائے۔ آپ خیال فرمائیں کہ شہر مکہ کو مسلمانوں کے حملے کی اطلاع نہیں، شہر مکہ کا سردار بھی موجود نہیں۔ سردار اگر ہوتا تو وہی حکم دے سکتا ہے کہ مکہ والے فوری طور پر کیا انتظامات کریں۔ رسول اکرمؐ اپنی فوج کے ایک سپاہی کو حکم دیتے ہیں کہ ابو سفیان کو فلاں مقام پر اپنے سامنے لئے کھڑے رہو تاکہ وہ دیکھے کہ مسلمانوں کی فوج کتنی بڑی ہے۔ دس ہزار کی فوج گزرتی ہے۔ ہر گروہ کے گزرنے پر اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ فلاں قبیلہ ہے۔ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی سواری وہاں پہنچتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے، بلکہ حضرت عباس اسے کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ کہتا ہے تیرا بھتیجا تو واقعی بادشاہ بن گیا۔ اس کی اتنی بڑی قوت ہے کہ بازنطائن کی سلطنت بھی اس سے ڈرنے لگی ہے۔ رسول اکرمؐ جب گزرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں کہ ابو سفیان کو چھوڑ دو۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب بات تھی۔ ابو سفیان ان حالات میں فیصلہ کرتا ہے کہ جنگ بیکار ہے کیونکہ مسلمانوں کی فوج شہر میں داخل ہو چکی

ہے۔ اگر میں حکم بھی دوں کہ مسلمانوں سے جنگ کی جائے تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور پھر جو فوج شہر میں داخل ہو رہی تھی اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلا چلا کر گلی گلی میں یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا۔ جو گھر کے اندر رہے' گلیوں میں نہ آئے' امن میں رہے گا۔ جو شخص خانہ کعبہ کے صحن میں چلا جائے گا یا جو شخص ابو سفیان کے گھر میں رہے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید ابو سفیان بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ابو سفیان اپنے مکان میں آتا ہے۔ اس کی بیوی جو رات بھر اس کے انتظار میں تھی' اس کو وہ بتاتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دس ہزار فوج کے ساتھ آیا ہے' ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی داڑھی پکڑ کر طمانچہ مارتی ہے کہ یہ تیری بزدلی کی وجہ سے ہوا ہے۔ کچھ اس طرح کے واقعات پیش آئے۔ شہر میں داخلے کے بعد رسول اکرمؐ ایک شخص کو ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے بھیجتے ہیں' وہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مکہ والوں کو چاہیے کہ خانہ کعبہ کے صحن کے اندر جمع ہو جائیں لوگ آئے۔ دلوں میں دہشت تھی کہ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ غالباً ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ رسول اکرمؐ حضرت بلالؓ کو حکم دیتے ہیں کہ اذان دو۔ اس دن وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر اذان شروع کرتے ہیں۔ حاضرین میں بہت سے مکہ کے غیر مسلم مشرکین موجود ہیں۔ ایک شخص جس کا نام عتاب بن اسید ہے اور جو بڑا سخت اسلام دشمن ہے وہاں موجود ہے۔ یہ آواز سن کر اپنے دوست سے جو پاس بیٹھا ہوا ہے کہتا ہے: "شکر ہے کہ میرا باپ مر چکا ہے' ورنہ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کالا گدھا خانہ کعبہ پر چڑھ کر' اللہ تعالیٰ کے گھر پر ہینگے۔"

اذان کے بعد نماز ہوتی ہے۔ نماز کے بعد رسول اکرمؐ مکہ والوں سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں کہ تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو؟" انہیں بیس سالہ ظلم' فتنہ انگیزی اور فساد یاد آتے ہیں اور وہ شرم سے سر جھکا لیتے ہیں اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپؐ شریف ہیں' شریف زادہ ہیں' شرافت ہی سے پیش آئیں گے۔ اس پر رسول اکرمؐ کے جواب کو تاریخ عالم میں لافانی ولاثانی کہنا چاہیے۔ ان کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: "تم پر اب کوئی مواخذہ' کوئی ذمہ داری نہیں' جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اور فوری اثرات بتادوں۔ ایک چھوٹی سی چیز کی طرف اشارہ

کرتا ہوں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو حکم دے سکتے تھے کہ سارے مکہ والوں کا قتل عام کیا جائے۔ آپؐ کے پاس اس کے وسائل موجود تھے۔ شہر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ فوج موجود تھی۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی جاتی۔ یہ بھی آپؐ کہہ سکتے تھے کہ سب کو غلام بنا لینے کا حکم دیتے یا کم از کم یہ حکم دیتے کہ ان کا سارا مال لوٹ لیا جائے۔ کہا تو یہ کہا کہ جاؤ! تم پر کوئی ذمہ داری نہیں تم سب آزاد ہو۔ عتاب بن اسید ابھی دو منٹ پہلے کہہ رہا تھا کہ کالا گدھا خانہ کعبہ پر ہینگ رہا ہے۔ وہ خود کو تحمل کرنے کے قابل نہیں پاتا۔ یکایک اچھل پڑتا ہے۔ رسول اکرمؐ کے سامنے آکر کہتا ہے۔ "میں عتاب بن اسید ہوں۔ **اشهدان لا اله الا الله و اشهدان محمد ارسول الله۔** " یہ واحد مثال نہیں تھی۔ راتوں رات شہر مکہ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ اور مسلمان بھی ایسا راسخ العقیدہ ہوتا ہے کہ دو سال بعد جب ملک کے بعض قبائل میں ارتداد کی کیفیت ہوئی تو سب سے مستحکم ایمان رکھنے والے لوگ مدینہ کے بعد مکے والے تھے۔

ایک چھوٹی سی چیز پر اس قصے کو ختم کرتا ہوں اور وہ مکہ کی فتح کے بعد ابو سفیان کی بیوی کا ایمان لانا ہے۔ اس کا نام ہندہ تھا۔ ہندہ وہ عورت تھی جس کا بیٹا' بھائی اور چچا جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ چنانچہ جنگ احد میں اس نے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چیر کر' کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ جب مسلمانوں کا مکہ پر قبضہ ہو گیا تو اس کے گھر میں ایک عجیب سین نظر آتا ہے۔ وہ ایک لکڑی لے کر گھر میں جو مختلف بت تھے ان کو مار مار کر پاش پاش کرنے لگتی ہے۔ کہنے لگی کہ اب تک ہمیں دھوکا دیتے رہے' اب معلوم ہوا کہ تمہارے پاس کوئی قوت نہیں۔ چنانچہ سارے بت اس نے توڑ دیئے۔ اس کے بعد اسے خوف تھا کہ شاید حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کی بے حرمتی کرنے کی وجہ سے جب رسول اکرمؐ مجھے دیکھیں گے تو مجھے سزا دیں گے۔ اس لئے چہرے پر نقاب ڈال کر' چھپ کر' عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ رسول اکرمؐ کے سامنے پہنچتی ہے اور وہاں اپنے اسلام لانے کا اعلان کرتی ہے' جس طرح اور عورتیں کر رہی ہیں۔ اس سے بھی جو بیعت لی گئی اس میں رسول اکرمؐ نے فرمایا "یہ وعدہ کرو کہ تم ایک اللہ کو مانو گی' بت پرستی اور شرک نہیں کرو گی۔" اس نے باواز بلند کہا۔ "ہم اب تک دھوکے میں تھے۔ اب ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ ان بتوں میں کوئی طاقت و قوت نہیں ہے۔ ہم ایک اللہ کو مانتے ہیں۔" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورتوں کو چاہیے کہ وہ بدکاری

نہ کریں۔" وہ بڑے فخر و غرور کے ساتھ کہتی ہے۔ "کوئی شریف عورت ایسا کر ہی نہیں سکتی وعدہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کے بعد رسول اکرمؐ ان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ "تم آئندہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو زندہ دفن کر کے قتل نہ کرو گی۔ اس وقت ہندہ کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ دل چسپ ہیں اس نے کہا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جن بچوں کو ہم نے پرورش کر کے بڑھایا' جوان کیا' آپؐ نے ان کو قتل کر دیا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہیں۔ پوچھتے ہیں۔ "کون عورت ہے؟" کہا جاتا ہے کہ ہندہ ہے۔ آپؐ اس سے بھی فرماتے ہیں "اب تم سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی۔" اس طرح یہ سین ختم ہو جاتا ہے۔ آپؐ کے اس طرز عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات کو سمجھ کر صحیح وقت پر ضرب لگانے میں جو فائدہ ہوتا ہے' وہ بے وقت نرمی یا سختی دکھانے سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں شہر مکہ کی فتح عمل میں آئی اور ہم نے دیکھا کہ فوج کو دشمن کے ملک کی طرف اس طرح بڑھایا گیا کہ اس کی خبر دشمن کو آخری لمحے تک نہ ہو سکی اور ایک بڑے شہر پر اس طرح قبضہ کیا کہ ایک قطرہ خون بھی نہ بہا۔

فوجی تیاریاں:- مجھے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالنی ہے کہ فوجی تیاریوں کے سلسلے میں کیا انتظامات ہوتے ہیں اور جنگ میں کس طرح مختلف کام انجام پاتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جنگ میں نرسنگ کے لئے' کھانا پکانے کے لئے' قبریں کھود کر مردوں کو دفن کرنے کے لئے' غرض ایسے بہت سے کاموں کے لئے' ابتدا ہی سے مسلمانوں کی فوج میں عورتیں ہی ہیں۔ بعض اوقات وہ عورتیں بھی نظر آتی ہیں جن کو سفر میں بچہ پیدا ہوا۔ نو ماہ کی حاملہ عورتیں بھی خوشی سے اس میں حصہ لیتی ہیں۔ نوعمر لڑکیاں اور بالغ لڑکیاں بھی اس میں حصہ لیتی ہیں۔ ان تفصیلات کا وقت نہیں۔ دو ایک چیزیں بیان کروں گا' وہ یہ کہ مسلمانوں کو ایک مستقل فوج (Standing Army) رکھنے کا شروع میں کوئی خیال نہیں تھا۔ رسول اکرمؐ نے اعلان فرمایا کہ جہاد کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ جس طرح نماز پڑھنا ایک فریضہ ہے اسی طرح جنگ میں حصہ لینا مسلمانوں کا ایک فریضہ ہے۔ جو لوگ مسلمان تھے وہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سارا ملک اور ملک کے سارے بالغ مرد (Potential Army) تھے۔ جس وقت' جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو' ان میں سے لے لیتے۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک مستقل فوج تیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بہرحال لوگوں کی فوجی تربیت کے لئے مختلف انتظامات کئے جاتے تھے۔ تفصیلات میں میں جا نہیں سکتا۔ صرف یہ بات عرض کروں گا

کہ فوج کو حالت امن میں جنگی کاموں کے لئے تیار کیا جاتا۔ گھوڑ دوڑ کرائی جاتی' اونٹوں کی دوڑ ہوتی تھی۔ گدھوں کی دوڑ ہوتی تھی' آدمیوں کی دوڑ ہوتی تھی' کشتیوں کے مقابلے کرائے جاتے تھے۔ اسی طرح تیر اندازی کے لئے بہت ترغیب دی جاتی' اس پر انعامات دیئے جاتے۔ گھوڑ دوڑ میں سبھی جیتنے والوں کو انعام دیا جاتا۔ غرض فوج حالت امن میں بھی تن دھن قربان کرنے کے لئے ہروقت تیار رہتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کی فوجی تیاریاں ان کے جذبہ ایمانی پر مبنی تھیں۔ اس لئے مٹھی بھر آدمی ہمیشہ تگنے' چوگنے' دس گنے دشمن سے بھی مقابلہ کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ دشمن کی اتنی تعداد ہے' ہم کیا کریں گے وہ جان پر کھیل جاتے تھے اور خدا انہیں فتح دیتا تھا۔

ایک آخری چیز پر اسے ختم کرتا ہوں جو میرے ذہن میں آئی ہے۔ جنگ کے دوران سپہ سالار کو مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا واقعہ لکھا ہے۔ جب کبھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مقام پر حملہ کرتے اور علی الصبح طلوع آفتاب کے وقت جنگ کا آغاز ہوتا تو اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے کہ آفتاب ہمارے آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ دشمن تمازت آفتاب سے متاثر ہو اور آفتاب ہمارے پیچھے ہو تاکہ جنگ کے وقت آفتاب کی روشنی سے چندھیا کر دشمن سے مقابلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ ایک دوسری چیز یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ کو "موسمیات" (Meteorology) سے بھی دلچسپی تھی۔ ہواؤں کے رخ کا خاص طور پر علم تھا۔ اس کا خاص لحاظ فرماتے کہ دشمن سے جنگ ہو تو ایسے مقام پر ہو کہ ہوا ہمارے پیچھے سے چل رہی ہو' نہ کہ ہمارے سامنے سے آئے اور ہماری رفتار میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں حدیث و سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حدیث جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انا نبی الرحمۃ وانا نبی الملحمۃ" یعنی میں رحمت کا بھی نبی ہوں اور جنگ کا بھی نبی ہوں' اس کا بعد میں دنیا کے بہترین سپہ سالار کی حیثیت سے مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح بہترین سیاست دان اور بہترین مدبر کی حیثیت سے بھی آپؐ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپؐ اپنے مقصد کا حصول چاہتے تھے۔ آدمی کا خون بہانا یا دشمن کا خاتمہ کرنا آپؐ کے پیش نظر نہیں تھا۔

باب 5

نظام تعلیم اور سرپرستی علوم

مسلمانوں نے بعد کے زمانے میں جو علمی ترقیاں کیں اور جس کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم بنے اور ساری دنیا کے لوگ عربی کتب کو پڑھ کر جدید ترین تحقیقات سے آگاہ ہوئے' اس کی اساس' ظاہر ہے عہد نبوی کی تیار کردہ بنیاد ہی ہو سکتی تھی۔

نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلا جو خدائی حکم ملتا ہے وہ یہ ہے کہ: **اقرا باسم ربک الذی خلق○ خلق الانسان من علق○ اقرا و ربک الاکرم○ الذی علم بالقلم○ علم الانسان مالم یعلم○** (96:1-5) اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پہلے جملے میں اللہ کی طرف سے ایک حکم آتا ہے اور پھر پڑھنے کی اہمیت بھی اس وحی میں بیان کر دی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ قلم ہی وہ واسطہ ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کا ضامن ہے۔ اسی ذریعہ سے انسان وہ چیزیں سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں ہوتیں۔ انسانی علوم اور دیگر مخلوقات خاص کر جانوروں کے علم میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے کہ حیوانات کا علم محض جبلی علم ہوتا ہے۔ اسی لئے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف انسانی علم صرف جبلی نہیں ہوتا اور اس میں روزانہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنا آباء و اجداد کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی تجربوں سے بھی اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور یہ سارا علم اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔

پہلی وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کے بارے میں حکم دینا ایسی بات ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ نبی امی کو کیوں پہلے ہی حکم میں اس طرف متوجہ کیا گیا اور اس کے

بعد چونتیس سالہ عرصہ گزرا' اس میں نہیں تو بیسیوں آئیتیں ایسی ملتی ہیں جن میں علم کی تعریف اور علم کی اہمیت سمجھائی گئی ہے اور اس میں عجیب و غریب چیزیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جائے گا: **وما اوتیتم من العلم الا قلیلا**" (85:18) (اور تمہیں علم نہ ملا مگر تھوڑا) دوسری طرف یہ بھی کہا گیا **قل رب زدنی علما**" (114:20) (اور عرض کرو کہ اے میرے رب مجھے علم زیادہ دے) اسی طرح کہ شاید ایک ضرب المثل بھی مشہور ہے **اطلبو العلم من المهد الی اللحد** (گہوارے سے قبر تک یعنی پیدا ہونے سے موت آنے تک علم سیکھتے رہو)۔

ایک حدیث:- ایک اور چیز ہے جس کی صحت کے متعلق ہمارے محدثین ٹیکنیکل نقطہ نظر سے اعتراض کریں گے' لیکن بہرحال وہ بھی اثر انگیز چیز ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ علم سیکھو چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ عقلی اور تاریخی نقطہ نظر سے مجھے اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بہرحال اس سلسلے میں پہلا سوال ہو گا کہ آپ' کو چین کا علم کیسے ہوا؟ جبکہ عرب ایشیا کے انتہائی مغرب میں ہے اور چین' ایشیا کے انتہائی مشرق میں ہے اور ان دونوں ممالک میں کسی طرح کا کوئی ربط یا تعلق نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے علم ہوا کہ چین میں علوم و فنون پائے جاتے ہیں؟ سوال معقول ہے لیکن اگر ہمارا مطالعہ ذرا وسیع ہو اور ہمیں اپنی علمی میراث سے ذرا زیادہ واقفیت ہو تو پھر یہ سوال باقی نہیں رہتا بلکہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ مثلاً مسعودی کی کتاب "مروج الذهب" کے نام سے ہمارا ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اسلام سے پہلے چینی بصرہ تک آتے تھے بلکہ عمان تک بھی پہنچتے تھے' اور یوں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے لئے چین اور چینی اجنبی نہیں تھے۔ اس سے بھی زیادہ قابل غور واقعہ ایک اور ہے کہ محمد بن حبیب البغدادی نے' جو ابن قتیبہ کا بھی استاد ہے' اپنی کتاب "المجر" میں لکھا ہے کہ ہر سال فلاں مہینے میں "دبار" نامی مقام پر ایک میلہ لگتا تھا جس میں شرکت کے لئے سمندر پار سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں ایرانی بھی ہوتے تھے' چینی بھی ہوتے تھے' ہندی اور سندھی بھی ہوتے تھے' مشرقی لوگ بھی ہوتے تھے' مغربی لوگ بھی ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ دباء کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب عمان کا علاقہ اسلام قبول کرتا ہے تو عمان میں ایک گورنر ہوتا ہے' اس کے علاوہ آنحضرت ایک اور گورنر کا تقرر صرف بندرگاہ کے امور کے لئے فرماتے ہیں۔ اس سے اس مقام کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً اس

انٹرنیشنل میلے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہوں گے' تجارتی جھگڑے' کاروباری معاملات وغیرہ۔ اس لئے عہد نبوی میں خصوصی افسر کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان دو واقعات کے بعد مسند احمد بن حنبل پر نظر ڈالیے' جس کے بعد ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان چینیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ مسعودی کے بیان کے مطابق چینی تاجر اپنے جہازوں میں سمندری راستے سے عمان کے علاوہ ابلہ بلکہ بصرہ تک جاتے تھے۔ اس دوسری روایت میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ دباء نامی بندرگاہ میں' جو جزیرہ نمائے عرب کی دو سب سے بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی' ہر سال میلہ لگتا تھا' وہاں ہر سال چینی لوگ آتے تھے۔ ان دو چیزوں کو ذہن میں رکھ کر مسند احمد بن حنبل کو پڑھیں۔ اس میں لکھا ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے لوگ جو عمان و بحرین میں رہتے تھے' مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ اس حدیث میں بحرین کا جو لفظ آیا ہے' اس روایت میں اس سے مراد وہ بحرین نہیں ہے جسے ہم آج کل بحرین کہتے ہیں اور جو جزیرہ نمائے عرب میں خلیج فارس کے اندر واقع ہے۔ اس زمانے میں اس جزیرہ کا نام "مساء اوال" لیا جاتا تھا اور بحرین کا لفظ اس علاقے کو ظاہر کرتا تھا جسے آج کل ہم "الدوماء" اور "الحطیف" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہرحال اس میں لکھا ہے کہ بحرین کے لوگ جن کا نام قبیلہ عبدالقیس ہے۔ اسلام لانے کے لئے مدینہ آتے ہیں۔ اس میں اس بات کی بھی تفصیل ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے کچھ سوالات کئے۔ مثلاً فلاں شخص ابھی زندہ ہے؟ یا کیا فلاں سردار زندہ ہے؟ فلاں مقام کا کیا حال ہے؟ آپؐ کے ان سوالات کو سن کر وہ لوگ حیرت سے پوچھتے ہیں یا رسول اللہ آپؐ تو ہم سے بھی زیادہ ہمارے ملک کے شہروں اور باشندوں سے واقف ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ ان لوگوں کے ایسے سوالات کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاؤں تمہارے ملک کو بہت عرصہ تک روندتے رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں میں وہاں بہت دنوں تک مقیم رہا ہوں۔ اس صراحت کے بعد ہمیں شبہ نہیں رہتا کہ رسول اکرمؐ غالباً شادی کے بعد حضرت خدیجہ کا مال تجارت لے کر نہ صرف شام جاتے ہیں' جس کی صراحتیں موجود ہیں بلکہ مشرقی عرب کو بھی جاتے ہیں تاکہ دباء کے میلے میں شرکت کر سکیں اور کوئی تعجب نہیں کہ آپؐ نے یہیں پر چینی تاجروں کو بھی دیکھا ہو اور ممکن ہے ان سے کچھ گفتگو بھی کی ہو۔ کیونکہ اگر چینی وہاں آیا کرتے تھے تو انہیں کچھ ٹوٹی پھوٹی عربی آ جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ وہاں پر یقیناً ایسے مترجم ہوتے ہوں گے جو چینی اور

عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ بہرحال اس کا امکان ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان چینیوں سے ملاقات کی ہو اور میرا گمان ہے کہ ان کے ریشمی سامان پر خاص کر آپؐ کی توجہ ہوئی ہو گی کیونکہ چین کا ریشم نہایت ہی مشہور چیز تھی۔ ممکن ہے ان کی صنعت و حرفت کے متعلق آپؐ نے بہت ہی اچھا تاثر لیا ہو اور ان سے پوچھا ہو کہ تمہارے ملک سے تک آنے میں کتنے دن لگتے ہیں اور مثلاً انہوں نے کہا ہو کہ چھ مہینے لگتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اندازہ قائم کرنے کے لئے یہ کافی تھا اور اس روشنی میں اب اس حدیث کو پڑھئے 'علم سیکھو چاہے چین ہی جانا پڑے جو دنیا کا بعید ترین ملک ہے کیونکہ علم کا سیکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے غرض ان ابتدائی چیزوں کے عرض کرنے کا منشاء یہ تھا کہ قرآن مجید و حدیث شریف میں علم حاصل کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے کیونکہ یہ انسانوں کے لئے نہایت مفید چیز ہے اور اسلام سے زیادہ فطری مذہب کون سا ہو سکتا ہے جو انسانوں کو ان کے فائدے کی چیز بتائے۔

تحریری زبان:- یہ کہنا دشوار ہے کہ مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے متعلق کیا کام کیا؟ کوئی مدرسہ قائم کیا یا مدرس مامور کئے؟ اس کا پتا چلنا آسان نہیں ہے۔ غالباً ایسا ہوا بھی نہیں۔ لیکن ایک چیز قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ہمارے مورخین کے مطابق عربی زبان طویل عرصے تک صرف بولی جانے والی زبان رہی تھی' تحریری زبان نہیں تھی۔ لکھنے کا رواج مکہ معظمہ میں' حرب کے زمانے میں ہوا۔ یہ ابو سفیان کے والد تھے یعنی یہ دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نوجوانی کا دور ہے۔ جو لوگ آپؐ سے معمر تر تھے' شہر مکہ میں ان کے زمانے میں پہلی مرتبہ خط و کتابت ہونے لگی۔ اس کی وجہ بھی یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک شخص عراق کے علاقہ حیرہ سے وہاں آیا تھا۔ اس نے مکہ معظمہ میں حرب کی بیٹی سے شادی کی اور اظہار شکر گزاری کے لئے انہیں یہ راز بتلایا کہ ایسی کام کی باتیں' جنہیں تم بھول جاتے ہو اور جنہیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے' انہیں کسی طرح لکھ لیا کرو۔ یہ روایت ہمیں مختلف کتابوں میں ملتی ہے' مثلاً قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج اور اس کے شاگرد بلاذری کی فتوح البلدان وغیرہ میں۔ دوسرے الفاظ میں مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج عہد نبویؐ سے کچھ ہی پہلے شروع ہوا تھا اور بلاذری کو تو اصرار ہے کہ عہد نبویؐ کے آغاز پر وہاں سترہ سے زیادہ آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ممکن ہے یہ مبالغہ ہو یا کسی خاص عہد کا ذکر ہو اور بعد میں اس صورت حال میں ترقی ہوئی ہو اور زیادہ لوگ لکھنا پڑھنا

جان گئے ہوں لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ البتہ یہ امر ضرور قابل ذکر ہے کہ قبل از اسلام مکے میں عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ شفاء بنت عبداللہ جو حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں' ان کو لکھنا پڑھنا آتا تھا اور اسی واقفیت کے سبب سے بعد میں' جب وہ ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو ابن حجر کے بیان کے مطابق' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ کے ایک بازار میں ایک عہدہ پر مامور کیا۔ چونکہ انہیں لکھنا پڑھنا آتا تھا' اس لئے کوئی ایسا ہی کام ان کے سپرد کیا گیا ہو گا جس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہو۔ ایک امکان میرے ذہن میں آتا ہے کہ اس بازار میں عورتیں ہی سامان تجارت لاتی ہوں گی لہٰذا ان کی نگرانی' ان کی مدد اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسی عورت ہی کو مامور کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال لکھنے پڑھنے کا رواج عہد نبویؐ کے آغاز کے زمانے میں ایک بالکل نئی چیز تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے ابھی زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیائے عرب کی سب سے پہلی لکھی جانے والی کتاب قرآن مجید ہے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ صرف چند ایک چیزیں ہیں مثلاً سبعہ معلقات' جن کو لکھ کر بطور اعزاز و احترام کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا۔ اسی طرح دوسرے معاہدے بھی لکھے جاتے ہوں گے۔ الفہرست میں ابن ندیم نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون کے خزانے میں ایک مخطوطہ یا ایک کاغذ کا پرچہ تھا جس میں ذرا بھدے خط کی کچھ عبارت تھی۔ لکھا ہے کہ عورتوں کے خط سے مشابہ تھا اور کہا ہے کہ وہ عبدالمطلب کا خط تھا۔

لفظوں کا استعمال:- ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا آغاز ہو رہا تھا اور ابھی زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ حیرہ سے آنے والا شخص وہی خط سکھائے گا جو حیرہ میں رائج ہے۔ یہاں کی زبان میں کل چوبیس حرف ہیں۔ جب کہ عربی میں حروف کی تعداد اٹھائیس ہے۔ ظاہر ہے کہ حیرہ میں رائج خط اس زبان کے لئے ناکافی ہو گا۔ اس کے علاوہ حیرہ میں رائج خط کے ذریعہ صرف نقطوں کی مدد سے عربی زبان کے تعداد میں زیادہ حروف میں امتیاز کرنا بھی دشوار تھا۔ عربی زبان کے حروف میں امتیاز کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ مختلف حروف کے سلسلہ میں ایک نقطہ نیچے لگا کر "ب" بنائیں اور اسی حرف پر ایک نقطہ اوپر لگا کر "ن" بنائیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں خطیب البغدادی وغیرہ متعدد لوگوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ غالباً اس کوتاہی کو دور کرنے کا کام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا تھا۔ روایت ہے کہ ایک

دن حضرت امیر معاویہ نے ایک کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ میں تمہیں کچھ لکھواتا ہوں' املا کراتا ہوں' اسے لکھو اور ر قش کرو۔ عیان کہتا ہے کہ "ر قش" کیا چیز ہے؟ وہ تبسم کر کے کہتے ہیں کہ میں ایک دن مدینہ منورہ میں تھا' رسول اکرمؐ نے کاتب کی حیثیت سے مجھے یاد فرمایا اور حکم دیا لکھو اور ر قش کرو۔ میں نے بھی پوچھا تھا یا رسول اللہ علیہ وسلم' ر قش کیا چیز ہے؟ حضور کے الفاظ یہ تھے کہ حروف پر جہاں ضرورت ہو' نقطے لگاؤ۔ اس چھوٹی سی روایت سے' جو ہمیں کئی کتابوں میں ملتی ہے' گمان ہوتا ہے کہ نقطے لگا کر حروف میں امتیاز پیدا کرنا بہت بعد کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ عہد نبویؐ میں پائی جاتی ہے۔ ہمارے پرانے مورخوں کے ہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا البتہ اس کی تائید میں اب کچھ اور چیزیں بھی ہمیں مل گئی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ طائف کے مضافات میں ایک کتبہ ملا ہے۔ حضرت معاویہ کے دور خلافت میں انہیں کے حکم سے طائف کے گورنر نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا' اس پر ایک کتبہ لگایا گیا۔ اس کتبے کے کئی حروف پر نقطے ہیں۔ یہ سنہ 50ھ کا واقعہ ہے۔ ظاہر ہے' بعد کی جعل سازی نہیں ہو سکتی۔ اس کتبے کے سب حروف پر نقطے نہیں ہیں بلکہ صرف چند حروف پر ہیں۔ یہ ذرا پرانی دریافت تھی اب ایک اور نئی چیز ہمارے سامنے آئی ہے جو اس سے بھی زیادہ موثر ہے۔ مصر میں کچھ پارچات دریافت ہوئے ہیں جن پر کچھ تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں حضرت عمر کی خلافت 22ھ کے زمانے کے دو خطوط ہیں۔ ان میں بھی نقطوں کا اہتمام نظر آتا ہے۔ یعنی حضرت عمر کے زمانے میں بھی ایک حد تک نقطے لگانے کا رواج تھا۔ اسے حجاج بن یوسف یا اس کے بھی بعد کی چیز قرار دینا درست نہیں۔

بہرحال خط کے سلسلے میں ایک طرف تو یہ بنیادی اصلاح ملتی ہے کہ حروف پر نقطے لگا کر ان میں امتیاز پیدا کرو۔ دوسری طرف کچھ اور حدیثیں بھی ملتی ہیں جو اگرچہ مسلم و بخاری جیسی کتب حدیث میں تو نہیں آئیں لیکن لائق توجہ ہیں۔ مثلاً ایک حدیث آنحضرتؐ کی جانب منسوب ہے' جس میں آیا ہے کہ جب تم کوئی خط لکھو تو اسے فوراً تہہ نہ کرو یہ ایک عقل مندی کی بات ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کی دلیل ہے۔ کیونکہ بعض وقت جلدی میں خط بند کر دیتے ہیں اور روشنائی گیلی رہتی ہے' جس کے باعث تحریر پر نشان پڑ جاتے ہیں اور وہ پڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس سے بھی زیادہ ایک اور چیز دلچسپ ہے جو ابن اثیر نے لکھی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم لکھو تو "س" کو ایک لمبے خط کی طرح نہ لکھو بلکہ اس میں شوشہ

کا اہتمام کرو، ورنہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ "بم" "ب" اور "م" کا مجموعہ ہے یا "س" اور "م" کا۔ خط کے سلسلے میں یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک آخری بات پر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں کہ جب ہجرت کر کے رسول اکرمؐ مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو "صفہ" کا مدرسہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ وہاں کے اور مدرسوں میں ایک مدرس لکھنے پڑھنے کا کام بھی جانتے تھے۔ اس کے سوا ان کا کوئی کام نہیں تھا۔ ان کا کام ہی طالب علموں کو خطاطی کی مشق کرانا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مدرس کی طرف توجہ رہتی۔

امثلہ کتابت:- ہجرت سے پہلے مکے میں قیام کے دوران میں لکھنے پڑھنے کی دو تین اور مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ مشہور صحیفہ ہے جس کے مطابق مکہ والوں نے آنحضرتؐ اور آپؐ کے خاندان والوں کا بائیکاٹ کیا تھا کہ کوئی شخص نہ اپنی بیٹی نکاح کے لئے دے اور نہ کوئی ان کی بیٹی لے، نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچے اور نہ ان سے کچھ خرید کرے حتیٰ کہ ان سے بات چیت تک نہ کرے۔ اس معاہدے کو لکھ کر کعبہ کے اندر لٹکایا گیا تھا تاکہ اس پر سنجیدگی سے عمل کیا جائے۔ مزید صراحت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس معاہدے میں جو صرف مکے والوں نے کیا تھا، ایک مزید حصہ دار کے طور پر بنو کنانہ کے لوگ بھی شامل ہوئے تھے۔ اس معاہدے کی طرف اشارہ کرنے والی، بخاری وغیرہ میں ایک حدیث بھی ملتی ہے۔ حجۃ الوداع یا شاید فتح مکہ کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل ہم ایک ایسے مقام سے گزریں گے جہاں ایک زمانے میں ظلم کی اعانت کی گئی تھی۔ اس سے مراد یہی تھا کہ بن کنانہ کے لوگ اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان کے خلاف کئے جانے والے معاہدے میں اہل مکہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ آپ اس سے واقف ہیں کہ کس طرح، اس تحریر کے باوجود، دیمک چاٹنے کی وجہ سے یہ معاہدہ بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ ایک دوسرا واقعہ حضرت تمیم الداری کے متعلق ہے۔ وہ ہجرت سے پہلے مکہ آ کر مسلمان ہوئے اور اپنی بہت سی داستانیں بھی سنیں جن کا صحیح مسلم میں ذکر ہے، جن میں جہاز رانی وغیرہ کی کہانیوں کا ذکر ہے۔ انہوں نے آنحضرت کو بتایا کہ میں نے سیاحت کے دوران میں فلاں فلاں مقامات اور چیزیں وغیرہ دیکھی ہیں۔ بہرحال انہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ملک شام سے آ رہا ہوں۔ آپؐ سے درخواست ہے کہ جب مسلم سپاہ شام فتح کر لیں، اس وقت شام کے فلاں گاؤں جاگیر کے طور پر مجھے دے دیجئے

جائیں اور اس کے لئے آپ مجھے ابھی پروانہ دے دیجئے۔ تو آنحضرتؐ کا وہ خط ہمیں ملتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر بیت مرطوم' جیرون' فلاں فلاں مقام فتح ہوں تو وہ تمیم الداری کو دے دیئے جائیں۔ یہ خط اصل ہے یا بعد میں تمیم الداری کی اولاد کی جعل سازی کا نتیجہ ہے' اس سلسلے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ لیکن امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں اس کا ذکر ملتا ہے اور یوں یہ تحریر و کتابت کی دوسری مثال ہمارے سامنے آتی ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ ہجرت کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو سراقہ بن مالک کا واقعہ پیش آتا ہے' جس نے آپؐ کو گرفتار کر کے اہل مکہ کے سپرد کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعض معجزات پیش آئے جن کے باعث سراقہ بن مالک نے معافی مانگی۔ معافی حاصل کرنے اور مدینہ کی جانب سفر میں آنحضرتؐ کی سہولت کی خاطر اپنے علاقے سے گزرتے ہوئے بعض آسانیاں فراہم کرنے کی پیش کش کے بعد سراقہ بن مالک نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پروانہ امن دیجئے۔ رسول اکرمؐ اپنے ہمراہیوں میں سے حضرت ابو بکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیتے ہیں کہ ایک پروانہ امن لکھو۔ گویا سفر میں آپ کے ہمراہ اور چیزوں کے علاوہ قلم' دوات اور کاغذ بھی موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج ترقی کرنے لگا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اہمیت سے خاص کر واقف تھے۔

جامعہ کا قیام:- مدینہ آنے کے بعد آپؐ نے سب سے پہلا کام عبادت گاہ کی تعمیر کے سلسلے میں کیا۔ چنانچہ جب آپؐ قبا میں پہنچے یہاں پر ایک مسجد بنائی گئی۔ جب قباء سے نکل کر آپؐ بنو نجار کے علاقے میں آئے تو وہاں پر مسجد نبویؐ کی تعمیر ہونے لگی۔ اس مسجد کی تعمیر میں کچھ عرصہ لگا۔ لیکن یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مسجد کا ایک حصہ تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کر دیا گیا۔ اسی مقام کو ہم صفہ کا نام دیتے ہیں۔ صفہ پلیٹ فارم' ڈائس یا بلند مقام کو کہتے ہیں۔ یہ مقام اس غرض کے لئے مخصوص کیا گیا کہ دن کو درسگاہ کا کام دے اور رات کو ان لوگوں کے لئے جن کا کوئی گھر نہیں ہے' سونے کا کام دے۔ ایک زمانے میں سیرت النبیؐ کی تالیف کے سلسلے میں مجھے تمنا ہوئی کہ عہد نبویؐ میں مسجد نبویؐ جیسی تھی' اس کا نقشہ بناؤں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس امر میں ایک الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ جب مسجد نبویؐ کی تعمیر ہوئی تو قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا اور کچھ عرصہ شاید ماہ بعد جیسا کہ تاریخ میں ذکر آتا ہے' قبلہ کعبتہ اللہ قرار پایا جس کے بعد مسجد میں تبدیلی

ضروری تھی۔ یوں اگر آج مسجد نبویؐ میں صفہ کا مقام قبلہ کے جنوب میں نظر آتا ہے تو عہد نبویؐ یعنی ہجرت کے ابتدائی ایام میں شمال میں ہونا چاہیے اور جب قبلہ کا رخ بدلا تو صفہ جو مسجد کے پچھلے حصے میں تھا' سامنے کے حصے میں آگیا اور وہاں نئے سرے سے "صفہ" بنایا گیا۔

یہ صفہ جسے موجودہ زبان میں Residential University کہتے ہیں وہاں طلباء کے رہنے کا بھی انتظام تھا اور تعلیم کا بھی۔ رہنے کے سلسلے میں ہمیں کئی اور وضاحتیں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ کہ اہل مدینہ اپنی انتہائی فیاضی کے باعث یہ کرتے کہ جب انصار کی کھجوروں کی فصل تیار ہوتی تو ہر شخص کھجوروں کا ایک ایک خوشہ تحفے کے طور پر لاتا اور اسے مسجد نبویؐ کے اندر صفہ میں لٹکا دیتا۔ جب کوئی کھجور پک کر گرتی تو صفہ میں رہنے والے غریب مسلمان اسے کھاتے۔ ان خوشوں کی حفاظت کے لئے بھی ایک شخص مقرر کیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل جب اپنی انتہائی فیاضی کے سبب مقروض ہو گئے اور قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں انہیں اپنا مکان تک فروخت کر دینا پڑا' تو انہیں بھی رہنے کے لئے صفہ میں جگہ دی گئی اور علاوہ اور چیزوں کے ان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ ان خوشوں کی نگرانی کریں۔ بہر حال آپ Residential University کا بھاری بھر کم لفظ قبول کریں نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صفہ میں تعلیم پانے والے طالب علم دو قسم کے تھے کچھ تو وہ تھے جو شہر میں رہتے تھے اور پڑھ کر چلے جاتے تھے' لیکن کچھ ایسے تھے جن کا کوئی گھر نہیں تھا اور وہ رات بھی وہیں گزارتے تھے۔ ان کی تعداد ظاہر ہے گھٹتی بڑھتی رہتی ہو گی۔ ان طالب علموں میں ہمیں حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہو گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے صفہ میں کیوں رہتے تھے؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے مواخاتی بھائی کے ہاں قیام کیا ہو گا اور ان کے ہاں اتنی جگہ نہ ہو گی کہ ان کے مواخاتی بھائی اور ان کے خاندان کے ساتھ حضرت عمرؓ اپنی بیوی کے علاوہ اپنے جوان اور بالغ بیٹے کو بھی جگہ دلا سکیں۔ ان حالات میں ایک دوسری تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر خود علم کے شوق کے باعث نہیں چاہتے تھے کہ قبا میں رہیں جو مدینہ سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ آنے جانے میں کافی وقت لگتا ہے۔ سارا وقت وہ مدینے میں گزارنا چاہتے ہوں گے تاکہ ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مواعظ سے استفادہ کر سکیں۔ بہر حال وہاں کچھ لوگ ایسے تھے جو صرف دن کو تعلیم پاتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو تعلیم بھی پاتے تھے اور رات کو رہتے بھی تھے

اور اس سلسلے میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کچھ تو ان چیزوں پر بسر اوقات کرتے تھے جو انہیں بطور تحفہ دی جاتی تھیں' کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے' کبھی مختلف صحابہ کی فیاضیوں کے باعث۔ مثلاً ایک بار کا ذکر ہے کہ اہل صفہ کے اسی آدمیوں کو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ایک دن اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ اس سے دو چیزیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو وہ تعداد جو کم و بیش صفہ میں موجود ہوتی تھی' دوسرے یہ کہ ان کے گزر بسر کا کیا انتظام تھا اور وہ کس طرح کھاتے پیتے تھے۔ ان دو باتوں کے علاوہ کہ آنحضرتؐ ان کے لئے سرکاری خزانے سے انتظام فرماتے اور صحابہ کی فیاضی کے سبب ان کو مختلف اشیا ملتیں' ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ دوسروں پر بوجھ بننے کی بجائے خود محنت کرتے تھے۔ یہ محنت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ پیسے جمع کر سکیں یا مالدار بنیں بلکہ صرف اس لئے کہ اپنا رزق حاصل کریں اور باقی پورا وقت علم کے حصول میں صرف کریں۔ ایک واقعہ کا ذکر ملتا ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ صفہ میں رہنے والے ایک طالب علم کی وفات ہوئی۔ جب اسے غسل دیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے پاس دو دینار ہیں۔ رسول اکرمؐ اس پر بہت ناراض ہوئے کہ ایسے شخص کو' جس کے پاس دو دینار جیسی خطیر رقم تھی' خیرات پر پرورش پانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بہرحال انسانی فطرت کی ایسی مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔

صفہ میں جو تعلیم ہوتی تھی وہ اسلام کی ابتدائی تعلیم تھی جس کے لئے میں Initiatory کا لفظ استعمال کر سکتا ہوں۔ مدرسہ میں جن چیزوں کی تعلیم ہوتی تھی' اس میں متعدد شعبے' متعدد لوگوں کے سپرد تھے۔ کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا سکھائے' کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ جو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں انہیں اس وقت تک کی نازل شدہ قرآنی آیات سکھائیں۔ شاید کسی شخص کا یہ کام بھی ہو کہ وہ فقہی احکام' سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نماز و عبادات وغیرہ کا درس دے۔ یہ اہتمام خاص طور پر ان لوگوں کے لئے کیا جاتا ہو گا جو وقتاً" فوقتاً" کچھ عرصے کے لئے مدینے آتے ہوں گے تاکہ اپنے نئے دین کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک حدیث کا ذکر کیا جو عبدالقیس کے لوگوں کی مدینہ آمد سے متعلق تھی۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں انصار کے سپرد کر دیا کہ تم ان لوگوں کی مہمان نوازی کرو۔ صبح کو ان لوگوں سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ تمہارے میزبانوں نے کیسا سلوک کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے ہمیں کھانے کے لئے نرم روٹی اور سونے کے لئے نرم بستر دیئے اور صبح کو

انہوں نے عبادت کے طریقے، قرآن شریف کی سورتیں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق چیزیں سکھائیں اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ صفہ میں تعلیم کے مختلف شعبے تھے۔ ایک چیز کا امکان ہے اور یقیناً ایسا ہی ہوا ہو گا کہ وقتاً فوقتاً خود رسول اکرمؐ ان کو درس دیتے ہوں گے۔ اگرچہ آپؐ کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں اس کے باوجود آپؐ کو جب بھی فرصت ملتی، آپؐ وہاں درس دیا کرتے تھے اور بہت سے لوگ جنہیں فرصت ہوتی، اس درس میں شریک ہو جاتے۔ ایک دلچسپ حدیث ہے کہ ایک دن رسول اکرمؐ اپنے حجرہ مبارک سے نکل کر مسجد کے اندر آئے اور دیکھا کہ وہاں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تسبیح پڑھنے اور ذکر و اذکار کرنے میں مشغول تھا، دوسرا گروہ علم حاصل کر رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں گروہ اچھا کام کر رہے ہیں لیکن وہ گروہ بہتر ہے جو تعلیم کا کام کر رہا ہے۔ پھر آپؐ بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح یہ بھی روایت ملتی ہے کہ صفہ کے بعد جلد ہی اور مدرسے قائم ہوئے۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ مدینے میں عہد نبویؐ میں نو مساجد تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے محلے کی مسجد میں اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کرو۔ سب کے سب مرکزی مسجد میں نہ آیا کریں کیونکہ اس طرح طالب علموں کی تعداد بڑھ جانے کا اندیشہ تھا، جس سے سب کی تعلیم متاثر ہوتی اور ناکافی اساتذہ کے باعث بچوں کے تعلیم پانے کا موقعہ نہ مل سکتا۔ اسی طرح ہمیں اور کا بھی پتہ چلتا ہے کہ تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو باہر بھی بھیجا کرتے تھے۔ غالباً ایسا ان علاقوں کے لئے ہوتا ہو گا جہاں کے باشندے رفتہ رفتہ مسلمان ہوتے گئے اور مسلمان ہونے کے بعد مطالبہ کرتے کہ ہماری تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ غالباً کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ ایسا ہی ایک واقعہ ہجرت سے قبل بھی پیش آیا تھا، جب خود مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں اسلام قبول کیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ہمیں ایک معلم دیا جائے تو مصعب بن عمیر کو بھیجا گیا اور وہ اہل مدینہ کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کراتے رہے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی بات یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ میں مسلمان ہونے والے اہل مدینہ کو اس وقت تک نازل شدہ قرآن شریف کا ایک تحریری نسخہ بھی دیا تھا جسے وہ اپنے محلے کی مسجد میں باواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے مورخ اس بات میں یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ مسجد میں با آواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا آغاز پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں انصار سے ہوا تھا۔

تعلیمی سہولتیں:- غرض ایک طرف ہمیں ایسی چیزیں ملتی ہیں جن میں علم کی اہمیت بتانے کے ساتھ ساتھ اس کو حاصل کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف ایسے انتظامات بھی نظر آتے ہیں جن کے باعث علم کا حصول آسان تر ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعہ کی جانب توجہ منعطف کراؤں گا۔ جنگ بدر میں بہت سے کافر قیدی ہوئے۔ ان قیدیوں میں جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مالی فدیہ طلب کرنے کی بجائے یہ فرمایا کہ ان میں سے ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ تعلیم کے انتظامات کے سلسلے میں یہ واقعہ قابل غور ہے۔ اسی طرح ایک اور بات پر غور کرنے اور اس سے نتائج استنباط کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ طبری کے بیان کے مطابق جب حضرت معاذ بن جبل یا عمرو بن حزم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو ان کا فریضہ یہ تھا کہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں ایک کمشنری سے دوسری کمشنری میں جائیں اور وہاں تعلیم کا انتظام کریں۔ اس کے علاوہ یمن کے گورنر عمرو بن حزم کی تقرری کے وقت' ان کو جو ہدایت نامہ دیا گیا' اسے بھی تاریخ نے محفوظ کر لیا۔ اس میں ہمیں ٹیکس' انتظامی معاملات اور عدل و انصاف وغیرہ کے متعلق ہدایات کے علاوہ یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کرو۔ گویا گورنر کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اپنی حدود (Jurisdiction) کے دائرے میں رہنے والے لوگوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم اسلامی تعلیم ہی ہو گی اور اس کا انتظام صرف مسلمانوں کے لئے کیا جاتا ہو گا' کیونکہ غیر مسلموں کی تعلیم کی بوجوہ ضرورت ہی نہیں تھی۔ قرآن مجید کے احکام کے مطابق تمام مذہبی گروہوں کو کامل داخلی خود مختاری عطا کی گئی تھی۔ جس طرح غیر مسلم اس خود مختاری کی بناء پر اپنے دیگر معاملات میں آزاد تھے' اسی طرح تعلیم کی صورت بھی رہی ہو گی۔ ان حالات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی تعلیم کا انتظام اسلامی حکومت کرتی تھی یا نہیں۔ اگر وہ کرتی تو اس میں کوئی امر مانع بھی نہیں تھا لیکن چونکہ عہد نبوی میں اس خصوصی نظام کے تحت ہر اقلیت کو کامل داخلی خود مختاری عطا کی گئی تھی' اس لئے انہیں اپنی تعلیم کی بھی آزادی تھی اور وہ خود اسے بہتر طور پر انجام بھی دے سکتے تھے۔ مثلاً ایک عیسائی بچے کو اسلامی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم دینے والا عالم تو مل جائے گا لیکن انجیل پڑھانے والا استاد میسر نہیں آ سکے گا۔ اس لئے ان کے حق میں یہی بات زیادہ سود مند تھی کہ ان کا مدرسہ ہی الگ ہو اور وہ اپنے مذہب کی تعلیم اپنے ہی اساتذہ کی مدد سے حاصل کریں۔

جنگ بدر کے قیدیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام لیا تھا۔ اس ایک واقعے کو ایک محدث نے اس عنوان کے تحت درج کیا ہے کہ کسی مشرک کو مسلمانوں کی تعلیم کے لئے استاد بنانے کا جواز ہے (جوال المعلم المشرک) کیونکہ مکہ والے مشرک اور کافر تھے اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے ان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں سے بھی علم سیکھنا جائز ہے اور اس میں کوئی امر مانع نہیں۔

تعلیم نسواں:- میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تعلیمات کے بغیر کوئی معاشرہ مسلمان معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسجد نبویؐ میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ ممکن ہے ان کے بیٹھنے کی جگہ الگ الگ ہو لیکن اس مقام پر' جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرماتے' دونوں کے لئے بیک وقت استفادہ کرنے کا امکان تھا۔ اس سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ سکول و کالج میں اس طرح کا انتظام کیا جا سکے کہ لڑکے اور لڑکیوں کی نشستیں جدا جدا ہوں تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ خاص طور پر اگر کسی فن کا ماہر صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد ہو تو اس سے دونوں کو استفادہ کرنا چاہیے' لڑکوں کو بھی لڑکیوں کو بھی۔ اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ دونوں کی تعلیم ۃ بیک وقت انتظام ہو سکے۔ مثلاً فرض کیجئے ایک پرانی کتاب ابو عبید قاسم کی ہے۔ اس کی روایت کرنے والوں کی فہرست میں سب سے نمایاں نام ایک عورت کا ہے۔ وہ اپنے گھر میں اس کا درس دیا کرتی تھیں اور درس کو سننے کے لئے مرد بھی آیا کرتے تھے۔ اس کا انتظام کہ مرد اور عورتیں اکٹھے درس میں شریک ہوں' کیسے ہوتا تھا' مجھے معلوم نہیں لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی استاد سے مرد اور عورت دونوں استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کا یہ فرمان کہ جب تم ازواج مطہراتؓ سے کوئی چیز پوچھنا چاہو تو پردے کے پیچھے سے پوچھو۔ ظاہر ہے کہ پردے کے پیچھے سے سوال کرنے کی ضرورت صرف مردوں کو پیش آ سکتی تھی' خواتین کے لئے اس کی ضرورت نہیں۔ ان مختلف پہلوؤں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضرورت اور حالات پر منحصر ہے کہ اگر دونوں کے لئے الگ الگ مدرسے اور کالج بن سکتے ہیں تو بہتر' ورنہ پھر تعلیم کا انتظام ایک ہی جگہ بھی ہو سکتا ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ لڑکیوں کی بڑی اکثریت اس قدر تعلیم پانے کا موقعہ نہیں پائے گی جس طرح لڑکا تعلیم حاصل کرنا چاہے گا۔ اس لئے لڑکیوں کو عام طور پر مڈل سکول یا ہائی سکول تک تعلیم' ان کی ضرورت کے مطابق دی جائے کیونکہ اس کے

بعد ان کی شادی ہو جاتی ہے اور انہیں اپنے گھریلو کام کاج میں مشغول ہو جانا پڑتا ہے۔ جن لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم پانے کی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ انتظام کو ترقی دی جا سکتی ہے اور خالص زنانہ یونیورسٹیاں نہ بھی بن سکیں تو بھی ان کی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا جا سکتا ہے کہ وہ قباحتیں پیدا نہ ہوں جو اب پیش آتی رہتی ہیں۔

تعلیم السنہ:- اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھی یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کسی علمی مسئلے کے سلسلے میں جھگڑا بھی کرتے۔ اس سے جو بعض نہایت کار آمد نتائج نکلتے ہیں ان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً ایک مرتبہ یہودی، آپؐ کے پاس ایک نوجوان جوڑے کو لائے اور کہا کہ ہم نے ان لوگوں کو قابل اعتراض حالت میں پایا ہے، آپؐ کے پاس لائے ہیں تاکہ آپؐ انہیں سزا دیں۔ اس سلسلے میں رسول اکرمؐ کے بجائے اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرنے کے یا اسلامی قانون نافذ کرنے کے خود ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری دینی کتاب توریت میں اس کے متعلق کیا احکام ہیں؟ انہوں نے جھوٹ بولا اور کہا کہ توریت کا حکم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا منہ کالا کر کے انہیں اس طرح گدھے پر بٹھایا جائے کہ ان کے منہ گدھے کی دم کی طرف ہوں، پھر سارے شہر میں ان کی تشہیر کرائی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایسا نہیں ہے۔ توریت کا حکم اس سے مختلف ہے۔ توریت لاؤ۔ چنانچہ توریت لائی گئی۔ اس میں رجم کی سزا نکلی اور اس کے مطابق مجرموں کو رجم کرایا گیا۔ اس کے متعلق مزید لکھا ہے کہ توریت کو پہلے ایک یہودی نے پڑھا اور اس آیت کو چھوڑ دیا جس میں رجم کا ذکر تھا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن سلام نے جو ایک نومسلم یہودی تھے، رسول اکرمؐ نے اپنے خاص کاتب وحی، حضرت زیدؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ تم عبرانی رسم الخط سیکھو کیونکہ مجھے آئے دن یہودیوں سے خط و کتابت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ایسی تحریروں کو میں یہودیوں سے پڑھوا کر سنوں تو مجھے اس پر اعتبار نہیں، اس لئے تم خود سیکھ لو۔ دوسرے لفظوں میں اجنبی زبانوں کو سیکھنے سے سیاسی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور علمی فوائد بھی۔ علمی فائدے کے متعلق ایک واقعہ ذہن میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جو اپنے باپ سے پہلے مسلمان ہوئے، نہایت ذہین، دیندار اور متقی نوجوان تھے۔ ساری ساری رات نفل نمازیں پڑھتے۔ انہوں نے روزانہ روزہ رکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ یہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دو انگلیاں چوس رہا ہوں۔ ایک

سے تو تھمہ نکل رہا ہے اور دوسری سے دودھ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن مجید اور توریت دونوں سے استفادہ کر سکو گے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ بعد کے زمانے میں انھوں نے سریانی زبان کی بھی تعلیم پائی اور بائبل کا ترجمہ سریانی زبان میں پڑھتے۔ اس طرح ایک دن وہ قرآن کی تلاوت کیا کرتے اور دوسرے دن توریت کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ غرض اجنبی زبانیں سیکھنے کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو چلا تھا۔ لکھا ہے کہ زید بن ثابتؓ کو چار پانچ زبانیں آتی تھیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی' اس کے علاوہ انہیں عبرانی' قبطی اور فارسی زبانیں آتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ جملہ لکھا ہے کہ انھوں نے فارسی زبان بہت جلد اس وقت سیکھ لی' جب ایک ایرانی وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یمن سے آیا۔ یہ وفد کچھ دن مدینے میں مقیم رہا۔ ان لوگوں سے قریبی روابط کے باعث زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اتنی فارسی سیکھ لی کہ اس زبان میں روز مرہ کی گفتگو کر سکیں' ان کی ضرورتیں معلوم کر سکیں اور ان کے مختلف سوالوں کے جواب دے سکیں۔ بہرحال تعلیم کے متعلق ایک طرف ان انتظامات کا پتہ چلتا ہے جو دارالسلطنت مدینہ منورہ میں کیے گئے' دوسرے وہ انتظامات جو ان علاقوں کے لوگوں کو دین سے واقف کرانے کے لیے کیے گئے جو بہت تیزی سے اسلامی سلطنت میں شامل ہو رہے تھے۔

علوم کی اہمیت:۔ تعلیم کے متعلق ایک اور پہلو کی جانب آپ کی توجہ منعطف کراؤں گا۔ ویسے یہ میرا استنباط ہے' اس کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف علوم کی اہمیت سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں۔ ان کے لیے الگ الگ درسی کتابوں کی بجائے ایک ہی درسی کتاب دینا پسند فرماتے اور چاہتے کہ ایک ہی شخص اس درسی کتاب کو ہمیشہ پڑھتا رہے' چاہے اس فن کی چیزوں سے اس کو دلچسپی ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص قرآن مجید کو بار بار پڑھے تو وہ اپنے فن کی چیزوں کو بھی پڑھے گا اور مجبور ہو گا کہ بغیر فن کی چیزوں کو بھی' خواہ سرسری نظر ہی سے سہی' پڑھے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے ایسی معلومات' جو اگرچہ اس کے فن سے متعلق نہیں ہیں' کسی بھی وقت سودمند ثابت ہو سکتی ہیں۔ قرآن مجید پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اس میں بے شمار علوم کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں صرف دین و عقائد' عبادات اور متعلقہ اخلاقی چیزوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں اور علوم بھی نظر آتے ہیں۔ اگر میں توریت کو بنی اسرائیل کی تاریخ کہوں تو اس میں پہلے تمہیدی باب کے

بعد، جس میں حضرت آدم علیہ السلام تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں، باقی سب چیزیں صرف بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اس طرح آپ انجیل کو پڑھیں تو وہ ایک ہی شخص یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری ہے، بلکہ پوری بنی آدم کی تاریخ ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار بادشاہوں، نبیوں اور قوموں کے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ ان گزشتہ لوگوں کے اچھے یا برے انجام کو سامنے رکھ کر پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ میں ان مقامات کا شمار کروں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں مصر، بابل اور یمن وغیرہ کے علاوہ بہت سے ملکوں کا ذکر ہے۔ اس میں ایک ایسے پیغمبر کا بھی ذکر آیا ہے جسے ہم ہندوستان سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغمبر حضرت ذوالکفل ہیں۔ ان کے متعلق قرآن وحدیث میں تفصیلی صراحت موجود نہیں ہے۔ بعض محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں اگرچہ لکھا ہے لیکن وہ قابل اعتماد نہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے تھے کہ غالباً اس سے مراد گوتم بدھ ہے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ ذوالکفل کے لفظی معنی کفل والے کے ہیں۔ اور کفل "کپل دستو" کی معرب شکل ہے۔ یہ بنارس کے قریب ایک شہر ہے جس میں گوتم بدھ پیدا ہوئے تھے۔ اس کی مزید تائید کے لئے وہ سورۃ "والتین" کی طرف اشارہ فرماتے تھے کہ: **والتین والزیتون وطور سینین وھذاالبلدالامین۔** "میں تمام مفسرین کے خیال میں چار پیغمبروں کا ذکر آیا ہے۔ زیتون سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن کو جبل زیتون سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اور سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں خدا نے انہیں توریت عطا کی۔ **ھذاالبلدالامین** یعنی محفوظ شہر سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ لیکن پہلا لفظ "والتین" کیا ہے؟ اس میں مفسرین خیال آرائی کرتے رہے۔ بعض لوگوں نے کہا، اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ بعض نے اس سے کسی اور نبی کی جانب اشارہ مراد لیا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی زندگیوں میں انجیر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ جب کہ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے تھے کہ گوتم بدھ کے ماننے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ گوتم بدھ کو جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ اس سے وہ استنباط کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا ذکر ہے، وہاں بدھ مت کا بھی ذکر ایک بہت لطیف انداز میں کر دیا گیا ہے۔ گوتم بدھ کے حالات چونکہ عربوں کو تفصیل سے معلوم

نہیں تھے لہٰذا اس پر زور نہیں دیا گیا۔

بہرحال ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم ہیں۔ اس میں تاریخ کا بھی ذکر ہے۔ اس میں ان علوم کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں ہم سائنس کا نام دیتے ہیں، مثلاً علم نباتات، علم ہیئت اور ٹیکنالوجی، یہاں تک کہ علم جنس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ قرآن شریف میں علم جنین کی اتنی مفصل تشریحات آئی ہیں کہ ان کا اس جدید ترین دور تک بھی اثر ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل پیرس میں ایک کتاب Bible, Quran and Scince آئی ہے جو ایک مشہور سرجن ڈیکائی کی تصنیف ہے۔ ڈیکائی کو بچوں کی ولادت کے علم سے دلچسپی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ علم جنین کے متعلق جو تفصیلات قرآن مجید نے دی ہیں ان کا علم نہ یونان کے مشہور قدیم اطباء کو تھا اور نہ زمانہ حال کے یورپی لوگوں کو ہے، جنہوں نے سالہا سال تک اس موضوع پر ریسرچ کی۔ لیکن اب سے چودہ سو سال قبل ایک بدوی اس کا ذکر کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن کی اسی بات سے متاثر ہو کر کچھ عرصہ قبل ڈیکائی نے اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہمیں بیالوجی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حیوانات اور موتیوں کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

میرا گمان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ہر مسلمان کو کچھ تو تعلیم بنیادی دی جائے جو لازمی ہے اور دیگر علوم کے بارے میں بھی اس کے پاس کچھ نہ کچھ معلومات ہوں جو کسی بھی وقت اس کے کام آ سکتی ہیں۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ قرآن مجید کو پڑھو، کیونکہ اس میں تقریباً تمام علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگر قرآن کو اس کی تفسیر کے ساتھ پڑھیں تو انسان کو بہت سے علوم میں شدید حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں بہت سے مذاہب کے عقائد کا ذکر آیا ہے، خواہ یہ ذکر ان کی تردید کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا قرآن مجید کو پڑھنے والے کا فریضہ یہ بھی ہو گا کہ تفسیر یا دوسرے وسائل کے ذریعے سے ان مختلف ادیان کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ ایسی معلومات اس کے لئے تبلیغ دین کے سلسلے میں بھی کار آمد ہو سکتی ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مناظرے کے وقت بھی۔ مثلاً دوسرے مذاہب کے لوگ سوال یا اعتراض کریں تو ان کے مذہب سے واقفیت بعض اوقات بڑی کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ لطیفے کے طور پر آپ سے ذکر کروں گا کہ ایک مرتبہ ایک فرانسیسی نن نے جو الحمدللہ اب حاجی طاہرہ کے

نام سے مسلمان ہو چکی ہے' تعداد ازدواج کے متعلق اعتراض کیا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر اور لوگ مجھ پر اعتراض کریں تو قبول' لیکن مجھے تم سے اعتراض کی توقع نہیں تھی کیونکہ آپ کے اپنے عیسائی مذہب کے مطابق نن خدا کی بیوی کہلاتی ہے۔ اس طرح تمہارے خدا کی تو لاکھوں بیویاں ہیں جب کہ تم صرف چار بیویوں کے سلسلے میں معترض ہو۔ اس بات کا اس کے دل پر 'ننا اثر ہوا کہ دو سال کی خط و کتابت کے بعد اس نے اپنا کانونٹ چھوڑ دیا اور مسلمان ہو گئی۔ بہرحال دوسرے مذاہب سے واقفیت کے باعث بعض اوقات بہت فائدہ ہوتا ہے۔

علوم کی سرپرستی:- عہد نبویؐ میں علوم و فنون زیادہ نہیں تھے لیکن جو فنون تھے' ترقی پذیر تھے اور ان کی ضرورت بھی تھی۔ ان میں سے ایک چیز طبابت ہے۔ اس کے متعلق ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ عہد نبویؐ میں طبیبوں کی حالت اور جراحی کرنے والے سرجنوں کے حالات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح ایک حدیث میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی بیمار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تمہارے محلے یا قبیلے میں کوئی طبیب ہے؟ جواب میں دو نام بتائے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ان میں سے جو ماہر تر ہو اسے بلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ (Specialisation) پیدا کریں اور ماہروں سے علاج کرائیں۔ اس سے لوگوں کو ماہر بننے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ اسی طرح اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ آنحضرتؐ طبابت سے ناواقف شخص کو اس کی اجازت دینا نہیں چاہتے کہ وہ طبیب بن بیٹھے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ جس شخص کو علم طب سے کوئی واقفیت نہیں' اگر وہ علاج کرے تو اسے سزا دی جائے گی کیونکہ اس کے اناڑی پن سے لوگوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے اس طرح کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں علم طب کی کافی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور علاج سادہ مفردات کے ذریعے ہوتا تھا۔ رسول اکرمؐ کی طرف سے بے شمار نسخے منسوب ہیں۔ لوگ آ کر آپؐ سے کہتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ تکلیف ہے تو آپؐ اس کے لئے تجویز فرماتے کہ فلاں چیز استعمال کرو وغیرہ۔ اب طب نبویؐ کا پورے کا پورا نظام اس طرح کی احادیث پر مشتمل ہو کر بن چکا ہے۔ زیادہ نہیں تو پندرہ بیس کتابیں میں دیکھ چکا ہوں۔

دوسرا علم جس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی تفصیل سے ہے'

علم ہیئت ہے۔ اس کے فوائد خود قرآن حکیم میں بھی بتائے گئے ہیں۔ اس علم کے ذریعے رات کے وقت مسافر اپنا راستہ معلوم کر سکتا ہے اس کے ذریعے اوقات کا اور حج کے زمانے کا تعین ہو گا۔ علم ہیئت کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑی اچھی واقفیت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد جب مسجد نبویؐ کی تعمیر ہوئی یا مسجد قباء تعمیر کی گئی تو قبلہ کے رخ کے تعین کا سوال تھا۔ محض اندازے کی بناء پر قبلے کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اکرمؐ کی علم ہیئت سے واقفیت کی بنا پر کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ آپؐ بیت المقدس سے کئی بار گزر چکے تھے۔ تجارت کے لئے جب آپؐ بصریٰ تشریف لے گئے تو بیت المقدس سے بھی آگے تک گئے تھے۔ یہ سارا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا اور زیادہ تر رات کے وقت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے تجربات کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف جانے والوں کو کس ستارے کی مدد سے آگے بڑھنا چاہیے اور اس طرح آپؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ کس ستارے کی مدد سے رات کے وقت بیت المقدس سے مکے اور مدینے جانے والوں کو اپنا سفر کرنا چاہیے۔ اس علم کی بناء پر آپؐ نے بغیر کسی خاص دشواری کے قبلہ کے رخ کا تعین فرما دیا۔ اس طرح کی اور چیزیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو علم ہیئت سیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کا احادیث میں بھی ذکر ملتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں کو اپنے انساب سیکھنے چاہئیں یعنی اپنے شجرہائے نسب معلوم کرنے چاہئیں۔ ان کی ایک عملی اہمیت یہ بھی ہے کہ کوئی محرم سے نکاح نہ کرے۔ عرب کے قبائلی نظام میں جس میں فلاں بن فلاں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا' اس بات کی خاص اہمیت تھی۔ اس طرح کی چیزیں صرف تاریخی معلومات ہی کے لئے نہیں بلکہ دیگر امور کے لئے بھی کار آمد ہو سکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں کچھ علوم پائے جاتے تھے جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرپرستی فرماتے تھے اور کچھ چیزیں مثلاً عسکریات وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں کو ترغیب و تشویق دلاتے تھے۔

باب 6

تبلیغ اسلام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو پہلو جو حقیقت میں ایک ہی پہلو کے دو جز ہیں یعنی اسلام کی تبلیغ اور اس تبلیغ کو قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ آپؐ کا برتاؤ' یہ دونوں پہلو اس باب کا موضوع ہیں۔ یہ بحث کچھ تو خود رسول کریمؐ کی سنت یا آپؐ کے ذاتی طرز عمل پر مبنی ہے اور کچھ ان احکام پر جو قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں۔ میرے علم میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو صرف اس موضوع پر لکھی گئی ہو۔ اس لئے میں کوشش کروں گا کہ تاریخی حیثیت سے دیکھوں کہ رسول کریمؐ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ کا طرز عمل کیا رہا اور کس طرح آپؐ اللہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ پھر اس کا جو رد عمل ہوا اس سلسلے میں آپؐ کا برتاؤ کیا رہا؟ کس طرح آپؐ اس کا مقابلہ کرتے رہے اور تاریخی نقطہ نظر سے اس کے کیا نتائج نکلے؟

پہلی وحی:۔ ہمیں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ پہلے دن کی وحی میں تبلیغ کا کوئی حکم نہیں ہے۔ پہلی وحی سورۃ اقرا کی پہلی پانچ آیتیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آپؐ کی امت کو یہ حکم دیا گیا۔ اس کے بعد ہمارے مورخ بیان کرتے ہیں کہ تین سال تک ایک وقفہ رہا جس کے لئے فترہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس دوران کوئی نئی وحی نہیں آئی۔ لیکن دوسری وحی کے نہ آنے کے باوجود' یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ ان پہلی آیتوں میں صاف طور پر تبلیغ کا حکم نہ ہونے کے باوجود عملاً اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تھے۔ میرے خیال میں یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ مکے میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ وحی کے فوراً بعد

آپؐ شہر واپس آ جاتے ہیں اور اپنے مکان میں پہنچ کر اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرماتے ہیں زملونی! زملونی (مجھے کمبلوں سے ڈھانپو' مجھے کمبلوں سے ڈھانپو) ظاہر ہے بیوی نے ایسے کیا ہو گا۔ کچھ اس سردی کی شدت کے اثر سے اور کچھ اس وحشت کی وجہ سے جو جبرائیل کی آمد اور ان واقعات کے مشاہدے کے باعث پیدا ہوئی' آپؐ کی حالت غیر تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو رسول کریمؐ نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنانے کے بعد آخری بات یہ کہی کہ کیا یہ شیطان کی کارستانی تو نہیں ہے؟ میں کوئی کاہن تو نہیں ہو گیا ہوں حالانکہ میں ساری زندگی ان لوگوں کو' جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں' برا کہتا رہا ہوں۔ آپؐ کی بیوی تسلی دینے کے لئے کہتی ہیں کہ یقیناً ایسا نہیں ہو گا کیونکہ تم زندگی بھر لوگوں کی مدد کرتے رہے ہو' غریبوں' محتاجوں' بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کرتے رہے ہو' اس لئے خدا ایسے شخص کا ساتھ نہیں چھوڑے گا' یقیناً خدا تمہیں شیطان کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس کے بعد آپؐ کی بیوی نے ایک اور جملہ کہا کہ میرا چچا زاد بھائی ہے' اس کا نام ورقہ بن نوفل ہے۔ وہ ان چیزوں سے بہت واقفیت رکھتا ہے۔ کل صبح ہم اس کے پاس جائیں گے۔ تم اس کو اپنا قصہ بیان کرنا' وہ تمہیں اعتماد سے بتا سکے گا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس کے بعد دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں' جو عیسائی تھا۔ دوسری روایت کے مطابق' اگلی صبح' غالباً حسب عادت حضرت ابوبکر آپؐ کے پاس تشریف لائے تو حضرت خدیجہ نے ان کو یہ واقعہ سنایا' یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی وہ ابوبکر کو یہ واقعہ سنائیں۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس بھیجا۔ ورقہ بن نوفل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضعیف العمری کے باعث نابینا ہو چکے تھے۔ یہ سن کر ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ "کچھ تم نے بیان کیا ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہے اگر میں اس وقت تک زندہ رہا جب تمہاری قوم تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے گی اور تمہیں اپنے شہر سے نکال دے گی' اس وقت میں تمہارا ساتھ دوں گا اور تمہاری مصیبتوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ "کیا اس بات پر کہ میں خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤں' لوگ مجھ پر ظلم و ستم کریں گے' اذیتیں دیں گے اور مجھے اس ملک سے نکال دیں گے!" تو ورقہ بن نوفل کا یہ بیان اپنے اندر اس بات کا قرینہ رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے تبلیغ کی' اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں اور اسلام قبول کیا۔ یہ بات صاف اور صریح الفاظ میں نہیں ملتی لیکن اس گفتگو کے پیش نظران امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابوبکر نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو قبول کر لیا کہ بے شک خدا کا فرشتہ آپؐ کے پاس' آپؐ کو نبی مامور کرنے کے لئے آیا ہو گا۔

ناموس:- میں اب ناموس پر کچھ بحث کروں گا۔ عام طور پر اردو میں یہ لفظ عزت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاق و سباق میں یہ معنی نہیں لئے جا سکتے۔ ہمارے بعض مفسریہ کہتے ہیں کہ ناموس کے معنی قابل اعتماد چیز کے ہوتے ہیں۔ یہ معنی بھی یہاں مناسب نظر نہیں آتے۔ میں شاید یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ جس سیاق و سباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے' وہاں ایک اور معنی مراد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورقہ بن نوفل عیسائی ہو چکے تھے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے جیسا کہ بخاری کی حدیثوں میں بھی ہے کہ انہیں سریانی زبان آتی تھی اور سریانی سے عربی زبان میں انہوں نے انجیل کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ سریانی زبان میں موجود ایک یونانی لفظ ہو۔ اگر اس مفروضے کی بناء پر ہم غور کریں تو فوراً اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یونانی زبان میں توریت کو "نوموس" Gnomos کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس کا جو پیغام نازل ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ اس مفہوم میں زیادہ پھبتا ہے اور زیادہ مناسب و معقول لگتا ہے۔ ان ابتدائی واقعات کے بعد' بجز مفروضات کے' یہ کہنا مشکل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا تھا۔ غالباً وہ بار بار مختلف لوگوں اور پوچھنے والوں کو اپنا واقعہ سناتے رہے ہوں گے کہ جبرائیل نے مجھے یوں کہا اور مجھے یہ بتایا۔ پہلی وحی کے سلسلے میں بلاذری کی "انساب الاشراف" میں کچھ تفصیلات اور بھی۔ مثلاً یہ کہ سورۃ اقرا کی پہلی پانچ آیتوں کے ابلاغ کے بعد حضرت جبرائیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً استنجے کا طریقہ بتایا کہ اپنے جسم کو نجاست سے کس طرح پاک کریں۔ اس کے بعد وضو کا طریقہ بتایا کہ نماز کے لئے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور سے تیار کرنا چاہیے۔ پھر جبرائیل نے امام بن کر نماز پڑھائی اور رسول اللہؐ نے مقتدی بن کر اسی طرح نماز پڑھی۔ اس کے بعد جبرائیل چلے گئے۔ ان حالات میں سیرت کی کتابوں میں یہ روایت پڑھ کر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ دونوں وقتاً "فوقتاً" کعبے کے سامنے علانیہ

نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ نماز مکہ والوں کی عبادت سے' ظاہر ہے مختلف تھی جس کے باعث لوگ حیرت سے انہیں دیکھتے تھے۔ ابھی تک قرآن کی وہ آیتیں نازل نہیں ہوئی تھیں جن میں بت پرستی کو برا بھلا کہا گیا تھا اور بتوں کی پرستش کرنے والوں کو جہنم میں جانے کا مستحق قرار دیا گیا تھا لوگوں کو اس نئے دین کے متعلق استعجاب ضرور ہوتا ہو گا لیکن ابھی ان میں کوئی عناد یا کوئی غصہ پیدا نہیں ہوا ہو گا۔ بہرحال ان دنوں دو تین مسلمان نظر آتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ ان کے بعد حضرت ابوبکرؓ ان کے بعد آپؐ کے چچا زاد بھائی جو آپ کے متبنی بیٹے بھی تھے' یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہ ان کے بعد آپؐ کے غلام حضرت زیدؓ گویا اولین مسلمانوں کی جماعت ان پانچ سات آدمیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اسلام لانے کے بارے میں دو مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق چونکہ وہ بہت کم سن تھے' اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر خود بھی آپؐ کی تقلید کرنے لگے۔ دوسری روایت جو غالباً کچھ عرصے بعد کی ہو گی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کعبے کے سامنے جا کر نہیں بلکہ شہر کے باہر صحرا میں یا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اسلام لانے کے بارے ایک تیسری روایت بھی ہے۔ ان اختلافی روایات کی سے یہ کہنا دشوار ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے کس زمانے میں اسلام قبول کیا۔ تیسری روایت پہلی وحی نازل ہونے کے کم از کم تین سال بعد کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ملا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی تبلیغ کریں: **وانذر عشیر تک الاقربین**○ (214:26) (اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ سے ڈراؤ)
چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدائی حکم کی تعمیل میں تبلیغ کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کو حکم دیا کہ بازار سے فلاں فلاں چیز خرید لاؤ اور بیوی سے کہا کہ ان سے ایک ضیافت کا اہتمام کرو۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہ کو بھیجا کہ خاندان کے سارے گھروں میں چچاؤں اور چچاؤں کے بیٹوں کے پاس) جاؤ اور انہیں دعوت دو کہ فلاں دن اور فلاں وقت کھانے کے لئے میرے پاس آئیں۔ ان لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ کس غرض کے لئے بلایا گیا ہے۔ وہ آئے لیکن سب ایک وقت میں نہیں آئے اور پھر آخر تک بھی نہیں بیٹھے بلکہ الگ الگ مختلف وقتوں میں آتے اور کھانا کھا کر جاتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخری شخص کے کھانا کھا چکنے کے وقت سوائے اس آخری شخص کے کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لئے اصل مقصد کہ خاندان کے لوگوں

میں تبلیغ کریں پورا نہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احتیاطاً کہتے بھی جاتے ہیں کہ کھانے کے بعد میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں' ٹھہرنا' انتظار کرنا۔ چنانچہ اب کی بار سب لوگ اس تجسس میں بیٹھے رہے کہ دیکھیں وہ کیا بات ہے جس کے لئے ہمیں بلایا گیا ہے۔ کھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مخاطب ہو کر بتاتے ہیں کہ بت پرستی کیوں بری ہے۔ اللہ کو ایک ماننا کیوں ضروری ہے۔ پھر اس کے نتائج یعنی آخرت کی زندگی اور خدا کے سامنے حساب و کتاب کا ذکر کیا۔ اس طرح کی چند بنیادی باتیں لوگوں کو بتائیں۔ اس سلسلے میں طبری کی روایت بہت دلچسپ ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ اس تبلیغ کا غالباً آخری جملہ یہ تھا کہ تم میں سے جو شخص میری دعوت کو قبول کرے گا وہ میرا جانشین اور خلیفہ ہو گا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو ابھی بچے تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب قہقہہ مار کا ہنسا اور تالی بجا کر کہنے لگا' ابو طالب مبارک ہو۔ آج سے تم اپنے بیٹے کے ماتحت بن چکے ہو۔ اس سے ابو طالب کو خفت سی ہوئی اس لئے وہ ساری عمر اس کے لئے آمادہ نہیں ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو قبول کریں۔ اس بیان کا منشاء تبلیغ کا طریقہ بتانا تھا۔

میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیسے ایمان لائے یا وہ کب ایمان لائے؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وحی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوسری وحی نازل ہوتی ہے جس میں یہ حکم آتا ہے کہ **فاصدع بماتومر واعرض عن المشرکین** (94:14) (جس چیز کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کر بیان کرو مشرکوں کی پرواہ نہ کر) اس حکم کے آنے پر رسول اکرمؐ ایک طرح کی دہشت محسوس کرتے ہیں کہ سارا شہر بت پرست ہے۔ اگر میں یہاں کے لوگوں کو برملا یہ کہوں کہ تمہارا دین غلط ہے اور تمہارے بت تمہارے لئے حفاظت اور نجات کا باعث نہیں بن سکتے' تو لوگ خفا ہوں گے' حضرت جبرائیل نے پھر آ کر تشفی دی کہ اللہ آپؐ کو نہیں چھوڑے گا' اللہ آپؐ کی حفاظت کرے گا۔ غرض کچھ اس طرح کی تفصیلیں ہمیں سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے باہر پہاڑی کے دامن میں یا پہاڑی کے کسی بلند حصے پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں جیسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ لوگ

دوڑے ہوئے آئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں فلاں قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔ جو لوگ اس قبیلے کے نہیں تھے وہ چلے گئے پھر اس کی ایک شاخ کا ذکر کیا کہ میں صرف ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ غرض بجائے سارے شہر کے لوگوں خطاب کرنے کے اس کے ایک محدود حصے کو اس دن آپؐ نے مخاطب کیا۔ خطاب کا انداز اس طرح تھا کہ اے بھائیو! اگر میں تم سے بیان کروں کہ اس پہاڑ کے پیچھے دوسری طرف ایک دشمن کی فوج آئی ہوئی ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم میری بات پر اعتماد کرو گے؟ ان کا جواب تھا کہ ہم نے تمہیں آج تک جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ اگر تم سنجیدگی سے کہتے ہو کہ واقعی کوئی دشمن اس طرف آیا ہوا ہے اور پڑاؤ ڈالے پڑا ہے تو ہم تمہاری بات پر یقین کریں گے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ تم کو اس انسانی لشکر سے بھی بڑے ایک دوسرے لشکر سے ڈراتا ہوں' یہ اللہ کا قہر اور عذاب ہے۔ اگر تم اللہ کو ایک نہ مانو گے اور بتوں کی پرستش نہیں چھوڑو گے تو مرنے کے بعد اللہ تمہیں دوزخ میں ڈال دے گا۔ اس دن اور لوگوں کے علاوہ آپؐ کا چچا ابولہب بھی وہاں موجود تھا۔ ابولہب نے جل کر کہا' کیا اس فضول بات کے لئے تم نے ہمارا وقت ضائع کیا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔

ابولہب کا طرز عمل:۔ بے محل نہ ہو گا اگر میں یہ بیان کروں کہ ابولہب کو اپنے بھتیجے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کیوں تھی۔ بلاذری نے "انساب الاشراف" میں اس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن گھر میں دونوں بھائی یعنی ابولہب اور ابوطالب کسی بات پر لڑ پڑے۔ اولاً ابولہب نے اپنے بھائی کو زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر چڑھ کر طمانچے لگائے۔ اس کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان دنوں دادا کی وفات کے بعد ابوطالب کی کفالت میں تھے' دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور ابولہب کو ابوطالب کے سینے سے دھکیل کر ہٹاتے ہیں۔ اس طرح ابوطالب کو اٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اب وہ ابولہب کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور اس کے سینے پر چڑھ کر اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ چاپ دیکھتے رہے۔ ابولہب جل کر کہنے لگا' اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوطالب بھی تمہارا چچا ہے اور میں بھی تمہارا چچا ہوں۔ پہلے تو تم نے ابوطالب کی مدد کی لیکن اب میری مدد کے لئے کیوں نہیں آئے؟ خدا کی قسم! میرا دل تم سے کبھی محبت نہیں کرے گا۔ "انساب الاشراف" میں یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ یہ نفسیاتی اصول ہے کہ جو

لوگ جتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں اتنا ہی وہ چھوٹی سی چیز کا زیادہ اثر لیتے ہیں اور ان کے دلوں پر اس کا دیرپا اثر رہتا ہے ممکن ہے یہی وجہ ہو جس کی بنا پر ابو لہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت پیدا ہو گئی اور کبھی اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اسلام کے انتہائی شدید دشمنوں میں سے ایک قرار دے دیا گیا۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد کا دین غلط اور لغو ہے۔ جن چیزوں کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہوتی گئی اور جلد ہی وہ نوبت آ گئی کہ شہر کی حکومت اور سربر آوردہ لوگوں نے بھی انہیں اس بات سے منع کر دیا کہ خانہ کعبہ کے سامنے آ کر اپنے طرز کی عبادت کریں۔ اس کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو اپنے مکان میں نماز پڑھتے یا گھر سے باہر کسی جنگل یا صحرا میں عبادت کیا کرتے۔ لیکن کافروں کی چھیڑ خانی میں کمی نہیں آئی۔ لوگ آپؐ کے پاس آتے، آپؐ سے بحث کرتے، آپؐ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے۔ ان میں آپؐ کا چچا ابو لہب پیش پیش رہتا۔ اسے پتہ چلا کہ جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپتے چھپاتے خانہ کعبہ کے سامنے آتے ہیں اور وہاں اپنے طرز کی عبادت یعنی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ آپؐ کی گزرگاہ میں خاردار درختوں کی شاخیں لا کر ڈال دیتا اور مکان کی دہلیز پر گندگی اور غلاظت لا کر ڈالا کرتا تھا۔ یہ وہ رکاوٹیں تھیں جن کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغام پہنچانے میں دشواری ہوتی رہی۔ لیکن آپؐ نے ہمت نہیں ہاری اور تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ایک نئی مشکل سے آپؐ کو سامنا کرنا پڑا وہ یہ کہ مکے کے باشندے وقتاً "فوقتاً" گلی کے لونڈوں کو ترغیب دلاتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے جائیں ان پر پتھر پھینکیں اور انہیں یہاں سے نکالیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدتمیز لڑکے پیچھا کرتے تو مقریزی نے بیان کیا ہے کہ ایسے وقت حضورؐ کبھی اتفاق سے ابو سفیان کے مکان کے قریب ہوتے تو ابو سفیان کے گھر میں چلے جاتے اور ابو سفیان مسلمان نہ ہونے کے باوجود اس قدر شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتا کہ فوراً آپؐ کی حفاظت کرتا اور گلی کے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان سے اپنے گھر جاتے۔ اس واقعے کا ذکر کرنے کے بعد مقریزی نے بہت بعد کے واقعے کی طرف ایک چھوٹا سا اشارہ کیا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو فتح کرتے ہیں تو ہمارے مولف لکھتے ہیں کہ فوج کے ہراول دستے یا مقدمتہ الجیش میں ایک منادی کرنے والا تھا جو گلیوں سے گزرتے وقت باواز بلند چلا چلا کر کہتا جاتا تھا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا جو شخص اپنے گھر کے اندر بند رہے' باہر نہ نکلے' امن میں رہے گا۔ جو خانہ کعبہ میں چلا جائے گا وہ امن میں رہے گا اور آخری چیز جس کی طرف اس وقت توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ کہ جو شخص ابو سفیان کے مکان میں جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔ مقریزی کہتے ہیں کہ یہ امتیاز اور خصوصیت اس واقعے کی بنا پر تھی کہ زمانہ قبل ہجرت جب کبھی مکے کے شریر بچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیتے اور آپ ابو سفیان کے گھر جاتے تو ابو سفیان آپ کو پناہ دیتا تھا۔ لہٰذا اس کے بدلے میں ابو سفیان کے مکان کو بھی پناہ گاہ قرار دے دیا گیا۔

دوسرے ملک میں تبلیغ:- اس تبلیغ کا سلسلہ کوئی چار پانچ سال جاری رہا۔ اس عرصے میں کفار کے ظلم و ستم اور اذیتوں کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ انہیں اپنے ملک میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر کچھ لوگ حبشہ چلے گئے۔ رخصت ہوتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ ہاں ایک عیسائی بادشاہ نجاشی حکومت کرتا ہے جس کے ملک میں کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ وہ لوگ حبشہ پہنچ گئے۔ اب چونکہ تبلیغ کی عام اجازت مل چکی تھی' اس لئے یہ مسلمان (مکے کے نو مسلم مہاجر) حبشہ میں تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں میں وہاں کافی تعداد میں' یعنی کم از کم چالیس پچاس' حبشی مسلمان ہو گئے۔ لیکن اس سلسلے میں انہیں دشواریاں بھی پیش آئیں۔ جب مکے کے نو مسلم ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو مکے کے مشرکوں نے نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا۔ اس وفد نے جا کر یہ مطالبہ کیا کہ ان مسلمانوں کو ہمارے سپرد کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں واپس لے جا کر پھر تکلیفیں دیں اور ستائیں۔ نجاشی نے صرف مطالبے کی بنا پر فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ تم لوگوں کے متعلق الزام ہے کہ تم اپنے شہر میں فتنہ و فساد کرتے رہے ہو اور وہاں کی سزا سے بچنے کے لئے یہاں آکر پناہ گزین ہو گئے ہو۔ تم لوگوں کا کیا جواب ہے؟ اب وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی جعفر طیارؓ جواب دیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں اس کا ذکر کروں' ایک ذاتی استنباط بیان کرتا ہوں جس کا ذکر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

مکتوبات میں نجاشی کے نام ایک مکتوب ہمیں ایسا بھی ملتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ میں اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب وہ پہنچے تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کر' ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور اس بارے میں ایسی ہٹ دھرمی اختیار نہ کر جو تیرے شایان شان نہ ہو۔ طبری میں یہ خط موجود ہے مگر اس میں یہ تفصیل نہیں ملتی کہ خط کب بھیجا گیا۔ سیاق و سباق سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ بعثت کے ساتویں سال سے پہلے کا خط ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہ ممکن نظر آتا ہے کہ یہ خط جعفر طیارؓ کو بطور تعارف دیا گیا ہو' خط لیکر گئے ہوں اور نجاشی کو بعثت کے پانچویں سال سے پہلے دیا ہو' کیونکہ ساتویں سال میں مسلمان مہاجرین حبشہ سے مدینہ واپس جا رہے تھے۔ واپسی کے وقت پناہ طلبی کے لئے تعارفی خط بھیجنا فضول سی بات نظر آئے گی۔ اس لئے مورخوں کے سکوت کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مہاجرین کی اولیں جماعت جس وقت حبشہ گئی ہو گی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ تعارفی خط دیا ہو گا۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ تعارفی خط کیوں دیا ہو گا' اگرچہ میں اس کی وجوہات سے باخبر ہوں۔

بہرحال مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کرتے تھے اور مسلمان ہو جانے والے لوگ جہاں جہاں جاتے' اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق نئے دین کی تبلیغ شروع کر دیتے' جس سے متاثر ہو کر لوگ ایمان لے آتے۔ چنانچہ جعفر طیارؓ کو جب نجاشی کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقعہ ملا تو انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ یہ لوگ ہم پر کیوں یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم فتنہ و فساد کرتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھ کر سنائیں بالخصوص سورہ مریم کی' جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے بغیر باپ کے حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے مورخوں کا بیان ہے کہ یہ تفصیل سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ ان آیتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتنے (اس تنکے برابر) بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہمیں مزید تفصیلات نہیں ملتیں کہ آیا نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن کچھ اشارے ایسے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ اگر اس وقت نہیں تو بعد میں نجاشی ضرور مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق' جس دن نجاشی کی وفات کی مدینے میں خبر آئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غیر مسلم کے لئے نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ تو یہ گمان کرنا چاہیے کہ

نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھجوائی تھی۔

تبلیغ کے سلسلے میں یہ چند ابتدائی باتیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ مشکل تر حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جب حبشہ بھیجی ہوئی مشرکین مکہ کی جماعت اپنے مقصد میں ناکام ہوئی تو وہ لوگ بقیہ مسلمانوں کو زیادہ سختی سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگے اور باتوں کے علاوہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے نہ کوئی شخص شادی بیاہ کے تعلقات رکھے' نہ ان کو بیٹی دے اور نہ ان سے رشتہ لے۔ نیز یہ بھی کہ نہ کوئی تجارتی چیز انہیں فروخت کرے اور نہ ان کی دکان سے کوئی چیز خریدے' حتی کہ ان سے بات چیت بھی نہ کرے۔ یہ قرارداد انہوں نے لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دی اور یہ عہد کیا کہ ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ یہ بائیکاٹ کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان شہید بھی ہوئے۔ بہت سے مسلمانوں نے ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں کہ انہیں یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بالآخر وہ بائیکاٹ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں واپس آتے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اب شہر کے باشندوں سے بات چیت بھی ناممکن سی ہو گئی ہے اور لوگ اسلام کو سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں' ان کے ذہن میں تبلیغ کے لئے ایک نئی تدبیر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اس شہر کو چھوڑیں اور کسی اور جگہ جا کر تبلیغ کریں۔ آپؐ شہر طائف کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہمارے مورخوں نے لکھا ہے کہ وہاں رسول اللہؐ کے ننھیالی رشتہ دار تھے' گویا ماموؤں کا علاقہ تھا کہ آپؐ بہت پرامید ہو کر گئے لیکن وہاں مکے سے زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے آپؐ کی حوصلہ شکنی کی اور دھمکی دی کہ آپؐ ان کا شہر چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ آپؐ کی جان کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ مجبوراً آپؐ شہر سے نکلے تو لوگوں نے گلی کے شریر لڑکوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ ان پر پتھر پھینکو اور انہیں ستاؤ۔ آپؐ زخمی ہو جاتے ہیں شہر سے باہر آ کر ایک باغ دیکھتے ہیں جس کے دروازے پر ایک دربان مامور تھا۔ آپؐ اس کی اجازت سے باغ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ دربان ایک نیک دل عیسائی تھا۔ اس نے ان شریر لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور اپنے مالک کی اجازت سے جو مکے کا رہنے والا تھا اور اس وقت باغ میں موجود تھا' اس بے بس مہمان کی میزبانی کرنے لگا۔ کچھ پھل توڑ کر اس نے رسول اللہؐ کو پیش کئے۔ اس وقت ایک واقعہ پیش آیا جسے شاید تبلیغ کا بالواسطہ

طریقہ کہا جائے۔ رسول اللہ ؐ نے بسم اللہ کہہ کر انگور کے ان دانوں کو کھانا شروع کیا۔ باغ کا مالی یا دربان حیرت سے پوچھنے لگا کہ تمہارے ملک میں یہ کیا طریقہ ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ میں نبی ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جو کام کروں' اللہ کا نام لے کر شروع کروں پھر آپؐ نے دربان سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں عیسائی ہوں۔ میرا وطن نینویٰ کا شہر ہے (اسے آج کل موصل کہتے ہیں) ایسی مصیبت آئی کہ گرفتار ہوا' بک گیا اور اب غلام کی صورت میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس شہر کے باشندے ہو جہاں میرا بھائی یونس علیہ السلام رہا کرتا تھا تو وہ عیسائی بے اختیار آپؐ کے قدموں کو بوسہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں یونس نبی رہا کرتے تھے۔ کچھ اس طرح گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ وہاں سے رخصت ہو کر مکے کی طرف لوٹے۔ تھوڑی دور جا کر آپؐ تھک کر ٹھہر جاتے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ آپؐ نماز میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نماز کے بعد دکھے ہوئے دل سے آپؐ دعا کرتے ہیں جو آج بھی ہم پڑھیں تو دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے الفاظ کم و بیش اس طرح ہیں: اے اللہ! میں تیرے احکام کی تعمیل کرتا رہا ہوں۔ تجھ سے اس لئے دعا کرتا ہوں کہ تو مصیبت زدوں کی ہمیشہ مدد کرتا ہے' تو غریبوں کی مدد کرتا ہے اور تو لوگوں پر رحم کرتا ہے۔ اس طرح کے اور لفظوں کے بعد آپؐ کی زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے کہ "ان ساری مصیبتوں اور ناکامیوں کے باوجود میں سب کچھ برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں اور میں اپنے کام کو جاری رکھوں گا' اگر تو مجھ سے خفا اور ناراض نہیں ہے۔" یہ وہ عزم تھا جس کا انتہائی مصیبت کے وقت بھی اظہار رہا۔

جب آپؐ کو اپنے وطن' شہر مکہ سے دوگر' شہر طائف میں' جہاں پناہ لینے لگے تھے وہاں ناکامی ہوتی ہے' کوئی یار و مددگار نہیں ہے' اس وقت بھی آپؐ کہتے ہیں "اے اللہ' اگر ان مصیبتوں کا باعث تیری ناراضگی نہیں ہے تو اے اللہ میں اس کام کو برابر جاری رکھوں گا۔" یہ ایک امتحان تھا جس میں آپؐ کامیاب ہوتے ہیں۔ اس نماز سے جب آپؐ فارغ ہوئے تو ایک سورہ نازل ہوئی جس کے الفاظ یہ ہیں کہ قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن (72:1) (آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ جنوں کا ایک گروہ مجھے سن رہا ہے) اس سے میں تو یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا اور نہ ان کے وجود کو محسوس کیا۔ جب تک خدا نے اطلاع نہیں دی' آپؐ کو اس کی اطلاع بھی نہیں ملی۔ لیکن رسول اکرمؐ انسانوں کے لئے بھی نبی تھے اور جنات کے لئے

بھی۔ اگر انسان آپؐ کی نبوت سے انکار کرتے ہیں تو کم از کم جنات کا ایک گروہ تو اسلام قبول کر رہا ہے یہ روشنی کی پہلی کرن تھی۔ جو اس تاریکی اور مایوسی کے عالم میں آپؐ کو دکھائی دی۔

قومیت چھن گئی: آپؐ آہستہ آہستہ پیدل مکہ واپس جاتے ہیں یہاں ایک نئی مصیبت آپؐ کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ یہ کہ شہر مکہ چھوڑنے کے بعد آپؐ کی قومیت ختم ہو گئی تھی۔ آپؐ اس وقت تک شہر مکہ شہر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے جب تک وہاں کا کوئی باشندہ آپؐ کو پناہ نہ دے۔ چنانچہ آپؐ ایک بدوی شخص کو کچھ رقم دے کر بھیجتے ہیں کہ فلاں آدمی سے جا کر کہو کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ وہ جاتا ہے مگر واپس آ کر کہتا ہے کہ اس شخص نے انکار کر دیا ہے۔ اسے کچھ اور انعام دے کر ایک اور شخص کے پاس بھیجتے ہیں وہ بھی انکار کرتا ہے۔ پھر ایک تیسرے شخص کے پاس بھیجتے ہیں وہ قبول کر لیتا ہے اور اپنے بچوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہتھیار بند ہو کر آتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضروری تھا کہ کعبے کا طواف کریں اور پھر گھر جائیں۔ چنانچہ رسول اکرمؐ علی الاعلان کعبے کا طواف کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر جاتے ہیں۔ یہاں میں یہ بیان کرتا چلوں کہ طائف کے اس سفر سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بڑے حامی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ آپؐ کے چچا ابو طالب اور آپؐ کی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ اسی مایوسی کے عالم میں آپؐ شہر چھوڑ کر طائف گئے تھے۔ اسی شہر مکہ میں آپؐ کی حیثیت اجنبیوں کی طرح تھی جو مقامی باشندوں میں سے ایک کی پناہ میں رہتے تھے۔ جس سے میں یہ معنی اخذ کرتا ہوں کہ اب رسول کریمؐ کو شہر میں آزادی نہیں تھی کہ سیاست میں حصہ لیں، یعنی تبلیغ دین کریں۔ اس کا حل بھی آپؐ نے نکال لیا۔ وہ یہ کہ شہر مکہ کے رواج کے تحت لوگوں کو ہر سال حج کے زمانے میں ایک طرح کا امن عام مل جاتا تھا۔ چنانچہ جو لوگ مجرم اور قاتل ہوتے تھے اور سارا سال چھپے رہتے تھے وہ بھی حرام مہینے میں، یعنی حج کے زمانے میں، کھلم کھلا باہر نکل سکتے تھے اور آ جا سکتے تھے۔ حضورؐ نے سوچا کہ شہر مکہ کے لوگ تو اسلام کے دشمن ہیں، ممکن ہے بیرونی قبائل یا غیر ملکوں سے آنے والے حاجی اسلام کو قبول کر لیں۔ چنانچہ آپؐ نے کوشش کی کہ حج کے زمانے میں باہر سے آنے والے قبائل میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ کافی جدوجہد کے بعد اس میں کچھ کامیابی ہوئی۔ ابن ہشام کے مطابق آپؐ کم سے کم پندرہ قبائل میں گئے۔ ہر ایک کو مخاطب کر کے یہ کہتے رہے کہ تم اسلام قبول کرو، اس کی یہ خصوصیات ہیں۔ جلد ہی قیصر و کسریٰ کی حکومتیں تمہارے قدموں پر نثار ہو جائیں

گی۔ مگر کسی نے قبول نہیں کیا سو آخری سولھویں گروہ کے' جس میں صرف انصار کے چھ آدمی تھے۔ وہ یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں' گویا آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم سب اسلام قبول کرتے ہیں۔

بات یہ تھی کہ شہر مدینہ میں بہت سے یہودی بستے تھے اور ہمارے مورخ بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی عربوں اور یہودیوں کا مدینے میں جھگڑا ہو جاتا تھا تو یہودی ان سے کہتے تھے' ذرا ٹھہر جاؤ آج تو تم ہمیں مار رہے ہو لیکن جلد ہی آخری نبی آنے والا ہے' جب وہ آئے گا تو ہم اس کی اتباع کر کے تم کو دنیا سے نیست و نابود کر دیں گے۔ تمہارے بچے' بوڑھے' عورتیں' مرد سب کو قتل کر دیں گے۔ ان مدینے والوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعی آخری نبیؐ ہیں تو کیوں نہ یہودیوں سے پہلے اسلام قبول کرلیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بزبان گفتگو کرتے ہیں پھر سب لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ ان کا اسلام مخلصانہ تھا۔ چنانچہ مدینے پہنچ کر وہ سب لوگ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس میں انہیں کامیابی بھی ہوتی ہے ایک سال بعد امن کے زمانے میں' یعنی حج کے مہینے میں' مدینے سے بارہ آدمی مکے آتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اس بیعت کے بعد ہمیں چند مناظر ایسے نظر آتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔

نامزدگی:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بارہ آدمیوں کو جو بارہ مختلف قبیلوں کے نمائندے تھے' اپنی طرف سے ان قبیلوں میں نائب یا سردار مامور کیا۔ اس میں ایک طرف تو ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں تنظیم تھی اور مسلمانوں میں ایک مرکزی نظام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نامزد کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے ماتحت' تھے کیونکہ جو کسی کو نامزد کرتا ہے وہ اس کو معزول بھی کر سکتا ہے۔ اس نامزدگی کے بعد وہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہمیں ایسا معلم دیجئے جو اسلام سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہو اور مدینے میں ہمیں دین بھی سکھائے جو بہت ہی مخلص مسلمان تھے اور نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ ان میو لوگوں کو اسلام پر آمادہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ انہیں بہت ہی شاندار کامیابیاں ہوئیں بیسیوں لوگ مسلمان ہوتے گئے' حتی کہ انتہائی اجڈ لوگ بھی اسلام قبول کرتے گئے۔

اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن حضرت مصعبؓ نے ایک باغ میں جا کر

وہاں کے لونڈی غلاموں اور بچوں کے سامنے تبلیغ شروع کی۔ مالک کو یہ تماشا برا لگا۔ اس نے ایک آدمی کو بھیجا کہ اس کو ڈانٹ کر نکال دو کہ ہمارے باغ میں اس طرح بلا اجازت آکر کیوں فساد کر رہا ہے؟ وہ شخص پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا۔ اس نے بہانہ کیا اور جا کر مالک کو بتایا کہ میں نے اسے بہت ڈانٹا مگر وہ نہیں مانتا' تم خود جا کر اسے نکالو۔ اصل میں اس کا منشا یہ تھا کہ یہ مالک بھی اسلام کی باتیں سنے اور اس شخص کی زبان سے سنے۔ جو اپنی جادو بیانی اور طلاقت لسانی سے ہر شخص کو اسلام کا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ وہ سردار بڑے طنطنے سے نیزہ ہلاتا ہوا آیا اور دھمکی دی کہ نکل جاؤ یہاں سے' ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ گھبرانے کے بجائے مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں' وہ یہ کہ یہ معلوم کئے بغیر کہ میں کیا کہہ رہا تھا' تم مجھے یہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم پہلے سن لو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے' تم کہو گے تو میں چلا جاؤں گا۔ وہ اجڈ شخص اپنے نیزے کو زمین میں گاڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" انہوں نے حسب عادت قرآن مجید کی ایک سورت کی تلاوت کی۔ تلاوت شروع ہوتے ہیں اسی کو سکون آگیا۔ چہرے پر خشونت کی جگہ ایک نئے شعور کی روشنی بکھر گئی پھر قبل اس کے کہ سورت کی تلاوت ختم ہوتی' وہ شخص اٹھا اور پوچھنے لگا کہ مجھے مسلمان ہونے کا طریقہ بتاؤ۔ چنانچہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے۔ پھر اپنی عادت کے مطابق سابقہ اجڈ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے زور سے نیزہ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کے اندر جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "آؤ' سب میرے پاس آؤ۔" چنانچہ عورتیں' بچے اور غلام سب بھاگ کر اس کے پاس آتے ہیں۔ اس نے سب سے پوچھا۔ "بتاؤ میں کون ہوں۔" سب نے کہا "آپ ہمارے سردار ہیں۔" اس نے کہا "میرا حکم ہے کہ تم سب مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم مجھ سے زیادہ کسی کو اپنا دشمن نہ پاؤ گے اس نیزے سے میں تم سب کو ایک ایک کر کے مار ڈالوں گا۔" اس طرح پورا خاندان مسلمان ہو جاتا ہے۔ جب سردار مسلمان ہو تو ظاہر ہے کہ سردار کے ماتحت لوگوں کا مسلمان ہو جانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ہمیں اسلام پھیلنے کے یہ مختلف طریقے نظر آتے ہیں۔

رافت و رحمت: یہ چیزیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری زمانے تک ملتی ہیں۔ دو ایک مثالیں اور دے کر میں اس بیان کو ختم کروں گا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے مکان میں ایک اجنبی مہمان آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کھانے کو بھی دیتے ہیں اور رات گزارنے کے لئے کمرہ بھی ہیں۔ وہ شخص بدنیتی اور دشمنی کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ علی الصبح کمرے میں بستر پر غلاظت کر کے قبل اس کے کہ لوگ بیدار ہوں' اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ صبح کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں آئے اور غلاظت دیکھی تو اس کو دھویا' بستر کو پاک صاف کیا۔ پھر دیکھا کہ وہ شخص جاتے ہوئے اپنی تلوار وہیں بھول گیا ہے۔ کچھ دور جا کر اس کو تلوار یاد آئی اور آہستہ آہستہ واپس آیا کہ ابھی لوگ سو رہے ہوں گے میں تلوار لے کر پھر واپس چلا جاؤں گا۔ مگر اس نے دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' بیدار ہو چکے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اس کے بستر کو صاف کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ڈانٹیں یا دھمکائیں' آپؐ فرماتے ہیں کہ تم اپنی تلوار بھول گئے تھے' یہ تمہاری تلوار رکھی ہے' لے لو۔ اس سلوک کے نتیجے میں یہ بے ساختہ پکار اٹھا: **اشھدوان لاالہ الااللہ واشھدان محمداً" رسول اللہ**

ایک اور واقعہ ملتا ہے کہ ایک جنگ کے سلسلے میں رسول اکرمؐ تشریف لے جاتے ہیں۔ فوج کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ جاتا ہے۔ دور تو نہیں بھاگتا' کیونکہ پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑ پر چڑھ کر کسی درے یا وادی میں چلا جاتا ہے۔ اس دشمن قبیلے کا سردار پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر دور تاکتا رہتا ہے کہ یہ فوج کیا کرتی ہے۔ اس دن بارش ہوئی۔ چنانچہ بارش کی وجہ سے رسول اکرمؐ اور آپؐ کے ساتھی تربتر ہو گئے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے اور اپنا کرتہ درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تاکہ وہ خشک ہو جائے۔ دشمن جو اوپر سے تاک رہا تھا' دیکھتا ہے کہ رسول اکرمؐ تنہا سوئے ہوئے ہیں۔ آتا ہے اور تلوار کھینچ کر چلا کر کہتا ہے (عربوں کا طریقہ تھا کہ سوئے ہوئے کو مارا نہیں جاتا تھا یہ ان کی شان کے خلاف تھا) اے محمد! تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔" رسول اکرمؐ بہت ہی سکون کے ساتھ کہتے ہیں "اللہ" اس جواب سے اس پر اتنا رعب ہوا کہ ہاتھ میں تھرتھری پیدا ہو گئی اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ تلوار کو اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اٹھا کر کہتے ہیں "اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" وہ کہتا ہے۔ "کوئی نہیں" تو آپؐ اس کو تلوار واپس کرتے ہیں کہ جاؤں میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ وہ اس مرحمت پر اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اب میں اپنے قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کروں گا۔ اس طرح فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عام معافی کا اعلان کرتے ہیں

تو اس کے رد عمل کے طور پر لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے ہیں اور راتوں رات سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ یہ تھے وہ طریقے جو تبلیغ اسلام کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائے اور نتیجہ میں واضح نظر آتا ہے۔

سب سے زیادہ پیرو:- انبیاء کرام کی زندگی میں ان کے ہاتھوں پر ایمان قبول کرنے والوں کی تعداد کا ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی سے مقابلہ کریں تو یہاں بھی آپؐ کو غیر معمولی فوقیت نظر آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل میں جو تفصیلات ملتی ہیں' ان سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس آدمی ایمان لائے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی قوم بنی اسرائیل کے لوگ جن کی تعداد پانچ لاکھ تھی ان کا ساتھ دے رہی تھی' لیکن ایک خود غرضی کے تحت تاکہ فرعون کے ظلم سے نجات پائیں۔ سچے دل سے ایمان لانے والوں کی تعداد تقریباً صفر تھی۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ خدا نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں فلسطین کا ملک دے گا' آگے بڑھو اور اس ملک پر قبضہ کر لو۔ تو انہوں نے کہا کہ ان جباروں سے ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارے خدا نے وعدہ کیا ہے تو تم اور تمہارا خدا دونوں فلسطین پر حملہ کرو اور قبضہ کر لو۔ پھر ہم آئیں گے اور اس ملک میں رہیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ساری قوم کافر اور نافرمان ہو جاتی ہے۔ آپؑ کی بات قبول کرنے اور ایمان لانے سے انکار کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف دو آدمی تھے جنہوں نے ایسا نہیں کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی' ایک آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام اور دوسرے آپ کے خادم حضرت یوشع جو بعد میں نبی بنے۔ ان دو کے سوا سارے بنی اسرائیل میں سے کسی نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ بہت ہی مخلص حواری تھے۔ ان میں سینٹ پیٹر کا آپ نے نام سنا ہو گا جن کی قبر (ویٹی کن) اٹلی میں ہے۔ ان کے متعلق انجیل ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کا قول ہے "حیا او شیطان" یہ ان کی کسی حرکت یا طرز عمل کی بنا پر کہا ہو گا۔ تفصیلات ہمیں معلوم نہیں۔ ایک اور حواری تھا جس کے متعلق تو صراحت ملتی ہے کہ اس نے ارتداد اختیار کیا۔ پولیس کو حضرت عیسیٰ کی ضرورت تھی' وہ انہیں تلاش کر رہی تھی۔ حضرت عیسیٰ غائب ہو گئے تو اس ساتھی نے جو مرتد ہو گیا تھا' پولیس کی مخبری کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرا دیا۔ اس کے برخلاف حضور اکرمؐ کے ہاتھ پر جو

لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی تعداد کا ایک حد تک تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ حجتہ الوداع جو وفات سے تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے' اس کے متعلق ہمارے مورخ لکھتے ہیں کہ اس وقت میدان عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار (1,40,000) آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اسلام میں حج کوئی ایسا فریضہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو ہر سال ادا کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے سب کے سب وہاں اس سال حج کے لئے نہیں آئے تھے۔ کچھ لوگ گھروں میں رہے' کچھ لوگ آئے۔ اگر بالفرض ہر پانچ میں سے ایک شخص آیا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب مسلمانوں کی تعداد کم و بیش پانچ چھ لاکھ ہو گی۔ کہاں دس بارہ آدمی' کہاں لاکھوں کی تعداد۔ ہمیں اسلام کی تاریخ میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد شاذ و نادر ہی کسی نے ارتداد کیا ہو' عہد نبویؐ میں ارتداد کی ایک آدھ مثال ہمیں نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں وہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد نہیں ہوئے بلکہ وہ منافق تھے' منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اسلام کو اندر سے نقصان پہنچانا چاہتے تھے لیکن جب ان کی چلی نہیں تو بھاگ نکلے اور پھر اپنے کفر کا کھلم کھلا اعلان کیا غرض یہ چند خاص باتیں ہیں جو تبلیغ کے سلسلے میں نظر آتی ہیں۔

غیر مسلموں سے سلوک:- اب سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کے متعلق اسلام کا برتاؤ کیا ہے۔ اس آیت سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہو گا **لا اکراہ فی الدین**" (256:2) **ان علیک الا البلاغ** (48:42) یعنی اسلام قبول کرنے کے لئے جبر کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔ پیغمبر کا فریضہ صرف ابلاغ و تبلیغ ہے' اس کے بعد نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ عہد نبویؐ اور خلافت راشدہؓ کے بارے میں حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کسی کو جبر کے ساتھ کبھی مسلمان نہیں بنایا گیا۔ غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے؟ قرآن میں یہ عجیب و غریب اصول ملتا ہے کہ ہر مذہبی کمیونٹی کو کامل داخلی خود مختاری دی جائے حتی کہ نہ صرف عبادات وہ اپنی طرز پر کر سکیں بلکہ اپنے ہی قانون' اپنے ہی ججوں کے ذریعے سے اپنے مقدمات کا فیصلہ کرائیں۔ کامل داخلی خود مختاری کا قرآن کی کئی آیتوں میں ذکر ہے جن میں سے ایک آیت بہت واضح ہے۔ **ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ** (47:5) یعنی انجیل والوں کو چاہیے کہ اس چیز پر عمل کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ ان احکام کے تحت عہد نبویؐ ہی میں قومی خود مختاری ساری آبادی کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان

اپنے دین' عبادات' قانونی معاملات اور دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے۔ اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی آزادی تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔ مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی ہے اور غیر مسلم رعایا کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان دین کی خاطر جنگ کریں تو غیر مسلموں کو اسلام کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ مسلمان جنگ کر کے اسلامی مملکت' ریاست اور اس کی حدود کی حفاظت کرتا ہے جس کے باعث وہاں رہنے والی غیر مسلم رعایا امن و امان سے متمتع ہوتی ہے جب کہ مسلمان اپنے ملک کی حفاظت کے لئے سر کٹاتے ہیں' لہٰذا فوجی ضروریات کے تحت غیر مسلم رعایا پر ایک ٹیکس عائد کیا جاتا ہے جو جزیہ کہلاتا ہے۔ یہ جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے ایران اور روم میں بھی جو لوگ فوجی خدمت انجام نہیں دیتے تھے' ان کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ چیز اسلام میں بھی آئی۔ غیر مسلم رعایا بہت ہی خفیف ٹیکس دے کر' جو سال میں دس دن کی غذا کے مترادف تھا' اسلامی سلطنت کی پوری حفاظتی قوتوں اور پولیس وغیرہ کی خدمات سے مستفید ہوتے رہتے اور جس وقت مسلمان اپنا سر کٹاتے' یہ اپنی تجارت اور کاروبار میں لگے ہوئے دولت کماتے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز غیر مسلموں کے متعلق ہمیں نظر آتی ہے کہ محض دین کی بنا پر ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ 2ھ میں جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو مکے والوں نے ایک وفد دوبارہ حبشہ بھیجا اور چاہا کہ وہاں پر جو مسلمان مہاجرین متمکن ہیں ان کو نئے نجاشی سے کسی طرح واپس حاصل کر لیں اور ان کو تکالیف دیں۔ جب اس کی اطلاع رسول اللہؐ کو ہوئی تو مورخوں نے لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ نے عمر بن امیہ کو اپنا سفیر بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کی سفارش کرے اور ان کی حفاظت کے لئے حکمران کو آمادہ کرے' حالانکہ عمر بن امیہ حمزی اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے ہمسائے میں یہودی رہتے تھے' اگر ان کے یہاں کوئی بچہ بھی بیمار ہوتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بچے کی عیادت کے لئے اس کے گھر جایا کرتے۔ یہ مختلف چیزیں ہیں جو غیر مسلموں سے برتاؤ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ایک اور چیز کہ مسلمان کا ہی نہیں یہودیوں کا جنازہ بھی شہر کی گلیوں سے گزرتا اور اتفاق سے رسول اکرمؐ وہاں کسی جگہ بیٹھے ہوتے تو جنازے کو دیکھ کر آپؐ کھڑے ہو جاتے تاکہ ان کے

ساتھ ایک طرح سے اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔ غرض مسلمانوں کا طرز عمل غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس قدر رواداری کا تھا کہ اس کی نظیر ہمیں تاریخ عالم میں کم ملتی ہے ان کا جو نتیجہ نکلا' اس کی طرف یہ اشارہ کرنا کافی ہو گا کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں خانہ جنگی ہوئی پھر اس کے بعد بارہا خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ کسی بھی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے زمانے میں غیر مسلم رعایا نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ وہ نہ اس فریق کا ساتھ دیتے نہ اس فریق کا ساتھ دیتے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمان حکومت سے غداری یا بغاوت کا خیال انہیں کبھی پیدا نہیں ہوا حتی کہ حضرت عثمان غنیؓ اور معاویہ کے زمانے میں قیصر روم نے پیام بھیجے اور وہاں کے اسلام ممالک کے عیسائی رعایا سے کہا کہ موقعہ ہے کہ تم بغاوت کرو۔ میں بھی اس وقت مسلمانوں پر حملہ کروں گا اور ان سے ہم نجات پائیں گے۔ اس ابتدائی زمانے سے لیکر کروسیڈز (صلیبی جنگوں) تک جب کبھی ایسے مطالبے کسی پوپ نے یا کسی عیسائی حکمران نے کئے تو ان کا جواب یہ تھا کہ ہم ان کافر حکمرانوں (مسلمانوں) کو تم جیسے ہم مذہب حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کبھی غیر مسلموں پر اسلام لانے کے لئے جبر نہیں کرتے تھے اور ان کو مذہبی و قومی معاملات میں پوری آزادی و خود مختاری دیتے تھے' حتی کہ ان کے مذہبی اداروں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ ایک عیسائی اپنے بعض ہم مذہبوں کو جو دوسرے شہر کے تھے یہ خوش خبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی' اس کے برخلاف وہ ہمارے گرجاؤں اور ہمارے کی مدد کرتی ہے۔

یہاں پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مثالی رواداری کے باوجود مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا ہے **لا اکرہ فی الدین** کے باوجود ایسا حکم دینے کا کیا جواز ہے؟ اس بارے میں میرا شخصی ردعمل یہ ہے کہ مرتد کو سزائے موت دین کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوری نہیں' اس لئے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور اسلام کے اندر آنے پر جبر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس کو دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا بھی دی جائے گی۔

باب 7

قانون بین الممالک

"انٹر نیشنل" کے لئے عام طور پر "بین الاقوامی" کا لفظ مستعمل ہوتا ہے' اس کے باوجود میں نے عمداً "بین الممالک" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اولاً" میں اس کی توجیہ کر دوں کہ یہ قانون اصل میں سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے متعلق ہوتا ہے' حالت جنگ میں بھی اور حالت امن میں بھی۔ سلطنت کے باشندوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی دو قوموں کے تعلقات سے اس میں بحث نہیں ہوتی بلکہ دو مملکتوں کے معاملات و مفادات سے بحث ہوتی ہے۔ آج کل اس کے لئے "بین الملل" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ لیکن کبھی کبھی عربی میں بین الدول کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔ یہاں "دولت" مملکت کے معنی میں ہے۔

قانون بین الممالک یعنی (International Law) ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کا رہین منت ہے اور مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے اس کو وجود بخشا۔ یہ ذرا عجیب سا دعویٰ ہے اس لئے کہ جب اس قانون کا تعلق دو خود مختار سلطنتوں کے باہمی تعلقات سے ہے اور خود مختار سلطنتیں آج سے نہیں بلکہ ہزارہا سال سے انسانی سماج میں موجود ہیں' ان میں جنگیں بھی ہوتی رہی ہیں' ان میں آپس میں پرامن تعلقات بھی رہے ہیں' اس لئے یہ کہنا کہ انٹرنیشنل لاء مسلمانوں کا رہین منت ہے' مسلمانوں نے اسے عروج بخشا ہے' تھوڑی سی وضاحت کا محتاج ہے۔ اصل میں اگر ہم اس علم کے آغاز پر غور کریں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا آغاز سلطنتوں سے نہیں' بلکہ اس سے پہلے ایک زمانے میں افراد سے ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی جگہ خود مختار ہوتا ہے اس لئے اس قانون کی اساس ابتداً افراد

کے باہمی تعلقات پر ہونی چاہیے۔ لیکن ہم اپنی علمی ضرورتوں کی وجہ سے اس کو افراد کے تعلقات سے نہیں ملاتے بلکہ ذرا اور بعد کے زمانے سے شروع کرتے ہیں۔ افراد کے بعد کنبوں اور خاندانوں کا زمانہ آتا ہے۔ ایک کنبے یا ایک کے تعلقات دوسرے کنبے یا خاندان سے ہوں' یہ بھی ایک معنی میں انٹرنیشنل چیز بن جاتی ہے۔ جب ہر کنبہ اپنی جگہ خود مختار ہو اور دوسرا کنبہ بھی مساوی خود مختاری کا حامل ہو تو ان کے کچھ باہمی تعلقات ہوتے ہیں لیکن اسے بھی ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں اس کی حیثیت اتنی اہم نہیں ہے کہ اس علم کے شایان شان ہو۔ اس کے بعد قبیلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک قبیلے میں بہت سے خاندان ہوتے ہیں اور ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ قبیلے خود مختار رہتے ہیں۔ مثلاً اسلام سے پہلے عرب میں ہر قبیلہ اتنا ہی خود مختار ہوتا تھا جتنی آج کل بڑی سلطنتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ نہ صرف حالت امن کے تعلقات میں بلکہ حالت جنگ میں بھی خود مختاری رکھتا تھا۔ ہر قبیلے کا سردار دوسرے قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کر سکتا تھا' صلح کر سکتا تھا۔ معاہدے کر سکتا تھا۔ غرض وہ تمام کام سرانجام دے سکتا تھا جن کو اب ایک سلطنت یا ایک مملکت اپنی امتیازی شان سمجھتی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے اہل علم قبائل دور کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کا آغاز مملکت سے کرتے ہیں' چاہے وہ چھوٹی ہی ہو۔

مملکت سب سے پہلے ایک شہر (City State) کی صورت میں وجود میں آئی ہے۔ غالباً فرنگی مصنفین اس کو سٹی سٹیٹ سے اس لئے شروع کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں یونان میں شہری مملکتیں پائی جاتی تھیں۔ ان میں آپس میں جنگیں بھی ہوتی تھیں' پرامن تعلقات بھی رہا کرتے تھے۔ بہرحال جو بھی ہو' اگرچہ اسلام سے بہت پہلے یونان میں سٹی سٹیٹ کا وجود تھا لیکن یہ صرف یونان سے مخصوص چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر حصے میں ہمیں نظر آتی ہے حتیٰ کہ عرب میں بھی قبل از اسلام سٹی سٹیٹ کا وجود نظر آتا ہے۔ عرب میں قبیلے بھی تھے اور شہر بھی تھے۔ قبیلہ اور شہر کا یہ فرق گویا اسلام کے انٹرنیشنل لاء کا ایک ابتدائی ماخذ تھا۔ وہاں قبیلے خانہ بدوش آبادیوں پر مشتمل تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسی بستی نہیں ہوتی تھی جہاں وہ سال کے بارہ مہینے رہیں۔ اس کے برخلاف شہر تھے جہاں کے رہنے والے خانہ بدوشی کی زندگی نہیں گزارتے تھے۔ اس طرح عرب میں ہم کو بیک وقت شہری مملکتیں بھی ملتی ہیں اور قبیلے بھی ملتے ہیں۔ غالباً یونان بھی ایک زمانے میں ایسا رہا ہو گا۔ لیکن جس زمانے کے حالات سے مغربی مصنفین بحث کرتے ہیں اس زمانے میں وہاں شہری مملکتیں

تھیں، یعنی لوگ بستیوں میں آباد تھے۔ بہرحال زیر بحث علم کا آغاز اس دور سے ہوتا ہے جب انسان فرد سے گزر کر کنبے اور خاندان سے گزر کر، قبیلے سے بھر گزر کر اس سے وسیع تر یونٹ یعنی شہری مملکتوں میں بسنے لگا تھا۔ اگر صرف فرد کا معاملہ فرد کے ساتھ ہو تو وہ بہت کمزور ہوتا ہے، چنانچہ ہم اس علم کی تاریخ میں دو رجحانات دیکھیں گے۔ ایک تو یہ ہے کہ تنہا فرد چونکہ کمزور ہوتا ہے اس لئے وہ کسی اور فرد سے مل کر اپنے آپ کو ایک حد تک اپنے دشمن کے مقابلے میں محفوظ بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مرد اور عورت دو مل کر ایک کنبہ بناتے ہیں تاکہ اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کریں اور تنہا ہونے کی بجائے دو آدمی ہوں تو اپنے کسی بھی دشمن، خواہ وہ فطرت کے مظاہر ہوں یا اپنے ہم جنس انسان ہوں یا کوئی جانور، ان سب کے مقابلے کی ان میں قوت آتی ہے۔ اس کے بعد جب افراد کو بھی محسوس ہوا کہ ہم دو، آدمیوں کو دوسرے دو آدمی شکست دے سکتے ہیں جو ہم سے زیادہ طاقتور ہیں تو انہیں نے سوچا کہ بہتر ہو کہ ہم بجائے زوجین کے (یعنی مرد اور عورت کے) بڑے کنبے میں رہیں تاکہ دوسرے دو افراد سے آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں، جس سے کنبہ وجود میں آیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کنبے بھی بہت کمزور ہیں اور ایک کنبے کا مقابلہ دوسرے کنبے سے ہو تو بعض اوقات مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں تو کنبے سے وسیع تر دائرے یعنی قبیلے میں رہنا پسند کیا گیا اجتماعیت (یا اپنی تعداد کو بڑھانے) کا یہ رجحان، انٹرنیشنل لاء اور انسانی فطرت کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ اس لئے کنبوں سے گزر کر قبیلوں میں اور قبیلوں سے بھی گزر کر شہری مملکتوں میں انسان بسنے لگا۔ کیونکہ ایک شہر میں کئی قبیلے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ کسی تنہا قبیلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو محفوظ بھی پاتا تھا اور شہر کے اطراف میں فصیل وغیرہ بنا کر اپنی حفاظت کا انتظام کرتا اور زیادہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزارتا۔

تاریخی جائزہ:- قدیم یونان کی تاریخ میں شہری مملکتوں کے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی جس کی بنا پر میں اس کو انٹرنیشنل لاء قرار دینے کے لئے آمادہ نہیں۔ یونان کے باشندے سب ایک ہی نسل کے تھے، سب ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک مذہب رکھتے تھے لیکن الگ الگ شہروں میں رہتے اور ہر شہر اپنی جگہ مطلق آزاد و خود مختار ہوتا۔ آپس میں لڑائیاں اور جنگیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن مغربی مصنفین کے بیان کے مطابق یونان کی شہری ریاستوں میں اگر کچھ معین قواعد تھے تو صرف اپنے ہم نسل یونانیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق تھے۔ ایک یونانی شہر جو خود مختار مملکت کی

صورت رکھتا' دوسرے یونانی شہر کے ساتھ تعلقات میں چند معین ضابطہ باقاعدہ نہیں تھا۔ کبھی کچھ برتاؤ ہوتا اور کبھی کچھ' کوئی اس سے بازپرس کا حق نہیں رکھتا تھا۔ یونانی قانون بین الممالک میں خامی یہ تھی کہ وہ صرف ایک محدود تعداد کے انسانوں سے متعلق تھا۔ باقی ساری دنیا کو وحشی قرار دے کر یونانی اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ کسی معینہ قاعدے پر عمل کریں۔ یہ معینہ قاعدے جو ہم وطن اور ہم نسل لوگوں سے متعلق تھے وہ بھی آج ہمیں وحشت کے حامل نظر آتے ہیں' لیکن بہرحال وہ معینہ قاعدے تھے۔ اس بنا پر ہم اس کو ایک اساس کے طور پر قبول کرتے ہیں کہ انٹرنیشنل لاء کے آغاز میں قدیم ترین مثالیں ہم کو یونان میں ملتی ہیں' جہاں خودمختار شہری مملکتیں حالت امن و جنگ میں چند معینہ قواعد پر عمل کرتی تھیں۔

اس کے بعد فرنگی مصنفین کے نزدیک انٹرنیشنل لاء کے ضمن میں رومی دور قابل ذکر ہے۔ اس دور میں شہری مملکتیں باقی نہیں رہی تھیں۔ لیکن شہر روما جو ابتداً ایک خودمختار شہر تھا' ایک بڑی وسیع سلطنت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو یورپ کے علاوہ شمالی افریقہ اور ایشیا تک کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس دور میں جنگ بھی ہوتی رہی اور پرامن تعلقات بھی ہوتے رہے لیکن میں اس دور کو بھی قانون بین الممالک کے لئے موزوں نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرنگی مصنفوں کے بیان کے مطابق' رومی سلطنت اگر جنگ یا امن کے زمانے میں معین قواعد پر عمل کرتی تو ساری دنیا کے ساتھ نہیں بلکہ صرف ان سلطنتوں کے ساتھ جن سے اس کے معاہدے رہے ہوں۔ مثلاً ایک سلطنت سے اس کے تعلقات پیدا ہوئے' دوستانہ معاہدہ ہوا اور پھر بعد میں کسی وجہ سے جنگ چھڑی تو وہ اس قابل سمجھی جاتی تھی کہ اس کے ساتھ معینہ قواعد پر عمل کیا جائے۔ باقی دنیا کے لئے کوئی قاعدہ نہیں تھا' صرف ذاتی صوابدید پر عمل ہوتا تھا۔ ایک مثال سے شاید آپ پر واضح ہو سکے کہ حقیقت کیا تھی۔ ابتدائی زمانے میں جنگ سے پہلے اعلان جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور اعلان جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ فوج روانہ ہوتی' دشمن کی سرحد تک پہنچتی تو ایک پادری یا مذہبی رہنما' ایک نیزہ دشمن کی سرزمین میں پھینکتا اور یہی اعلان جنگ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جنگ شروع ہو جاتی۔ بعد کے زمانے میں جب رومی سلطنت بہت وسیع ہو گئی تو دشمن کی سرحد تک پہنچنے میں ہفتوں لگ جاتے تھے۔ ایسے میں ان پادریوں کو شہر روما سے وہاں تک جانے میں زحمت محسوس ہونے لگی۔ اس کا انہوں نے ایک حل سوچ لیا اور وہ یہ کہ شہر روما کے سرکاری خزانے میں مختلف ملکوں

کی مٹی تھیلیوں میں بھر کر رکھ لی گئی۔ جب اعلان جنگ کی ضرورت ہوتی تو اس خاص شہر کا تھیلا نکالا جاتا اور پادری صاحب اس تھیلے میں نہایت ہی متانت کے ساتھ اپنا نیزہ گاڑ دیتے۔ اس طرح کی عجیب و غریب باتیں انسانی تاریخ میں ملتی ہیں۔ لیکن اس موضوع کے سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہم رومی عہد کو بھی انٹرنیشنل لاء کے لئے موزوں قرار نہیں دیتے۔ ان کا قانون اگرچہ جنگ و امن کے متعلق تھا لیکن وہ اسے ساری دنیا کے لئے یکساں نہیں برتتے تھے۔ انٹرنیشنل لاء کے مشہور انگریز مورخ' اوپن ہائم نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ رومن دور میں غیر ممالک کے ذکر یا ان کے معاملات پر بحث کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ گنجائش ہے۔ اس کی یہ رائے رومیوں کے اس دعویٰ پر مبنی ہے کہ دنیا رومیوں کا کرہ ہے' رومیوں کی ملکیت ہے۔ کوئی اپنے گھر کے اندر قانون الممالک کا استعمال نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ رومن دور میں حقیقی معنوں میں انٹرنیشنل لاء کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اسلامی قانون پر اثر:- حال ہی میں ایک عربی کتاب "تاثر الفقہ الاسلامی من القانون الرومی" آئی جو پانچ مغربی فضلاء کے مقالات کے ترجمہ پر مشتمل ہے اور ان پانچوں نے اسی موضوع سے بحث کی ہے کہ آیا اسلامی قانون پر رومی قانون کا اثر ہوا ہے یا نہیں؟ ان مولفوں میں سے ایک اطالوی ہے' ایک انگریز ہے' ایک فرانسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ پانچوں کے پانچوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلامی قانون پر رومی قانون کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا' اور اس پر وہ بھی حیرت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مولف نے اپنے مقالے کا عنوان ہی The.Mystery.of.the.Foundation.of.Muslim.Law. رکھا اور ان مقالے میں اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اسلامی قانون خود بخود کیسے بن گیا؟ دوسرے الفاظ میں سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی قانون پر اگر رومی قانون کا اثر ہوا ہوتا تو اس کا کوئی وسیلہ ہونا چاہیے تھا۔ اولاً" رومی قانون لاطینی زبان میں ہے لیکن موجودہ صدی کے نصف آخر تک مغربی زبانوں یا کسی بھی زبان میں' اس کے کسی ترجمے کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کی ابتداء ہی سے' قرآنی احکام کے تحت' ہر قوم کو قانونی خود مختاری دے دی۔ یعنی اگر دو عیسائیوں میں جھگڑا ہوا تو قانون بھی عیسائی ہو گا' جج بھی عیسائی ہو گا' فریقین بھی عیسائی ہوں گے۔ غرض یہ کہ انہیں اسلامی عدالت میں آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ اگر دو مسلمانوں میں جھگڑا ہوتا تو قرآن کے مطابق

فیصلہ کیا جاتا۔ ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ اسلامی کتابوں اور رومی قانون کی کتابوں میں سے ایک ایک کو لیجئے' اگر ایک دوسرے سے ماخوذ ہے تو ظاہر ہے کہ جس نے اخذ کیا ہو تو اس پر اصل ماخذ کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ جاتے ہیں۔ مگر ہمیں اسلامی قانون میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مثلاً رومی قانون کو "لیس "Jus کا نام دیتے ہیں اور مسلمان "فقہ" کا۔ "لیس" کے معنی ہیں حقوق اور فقہ کے معنی ہیں معرفت۔ مسلمانوں نے اپنے قانون کو لیس یا حقوق کا نام کبھی نہیں دیا۔ اگرچہ موجودہ دور میں حقوق کی اصطلاح بڑھتی جا رہی ہے' جس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے طلبہ یورپ کے مختلف ملکوں مثلاً فرانس' جرمنی' برطانیہ اور اٹلی وغیرہ میں قانون پڑھتے ہیں۔ وہاں اس کے لئے حقوق کا لفظ پڑھتے ہیں تو وہ اصطلاح اپنے ہاں بھی برتنے لگتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے قانون کو علم الحقوق نہیں کہا بلکہ اسے علم الفقہ ہی کہتے رہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ رومن لا کی کتاب کو کھولیے تو اس کا پورا مواد تین اقسام پر مشتمل نظر آئے گا۔ قسم اول کا نام ہو گا (Person) یعنی اشخاص کا قانون۔ پھر (Property) یعنی مال کے متعلق قانون' جب کہ تیسری قسم کو (Actions) مقدمات کا نام دیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کی کتاب کو کھولیے تو پہلے عبادات ملیں گی۔ یعنی نماز' روزہ' حج' زکوۃ۔ اس کے بعد معاملات ملیں گے۔ اس کے بعد قانون تعزیرات ہو گا۔ اگر رومی قانون سے اسلامی قانون متاثر ہوا ہوتا کم از کم ان خالص تکنیکی چیزوں میں تو اس کے اثرات باقی رہتے یعنی اسلامی قانون بھی اشخاص' مال اور مقدمات پر مبنی ہوتا۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ پھر اس کو بھی دیکھیے کہ اسلامی قانون میں بلا استثنا حنفی' مالکی' شافعی اور شیعہ وغیرہ تمام فرقوں کی کتابوں میں عبادات کا ذکر پہلے آتے ہیں۔ لیکن رومی قانون کی کسی کتاب میں عبادات کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون پر رومی قانون کا اثر ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز بھی بیان کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جس زمانے میں مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کیا جو باز نطینی سلطنت کا حصہ تھے' اس زمانے میں وہاں پر رومی قانون نافذ ہی نہیں تھا' مختلف وجوہ سے مقامی باشندوں کو خود مختاری دے دی گئی تھی اور ان کے معاملات عدلیہ کو ان کے مذہب کے افسروں یعنی پادریوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب رومی قانون کا اس علاقے میں وجود ہی نہیں تھا جہاں مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا تو اس سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک اور

چیز بھی ہمارے مولف بیان کرتے ہیں کہ رومی قانون کی تعلیم شہر بیروت میں ہوتی تھی۔ بعض مولفوں نے کہا ہے کہ غالباً اس مدرسہ کے اثرات مسلمانوں پر پڑے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مدرسہ اسلام سے دو سو سال پہلے بند ہو چکا تھا اس زمانے میں وہاں اس کا وجود ہی نہیں تھا۔

بہرحال اس کے بعد یکایک ایک ہزار سال کی جست لگا کر یورپی مورخ بیان کرتے ہیں کہ انٹرنیشنل لاء چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے اس دوران میں جو اسلامی دور گزرا ہے اس کا کوئی ذکر وہاں نہیں ملتا۔ لیکن جسے مغربی مصنفین ماڈرن انٹرنیشنل لاء کہتے ہیں میں اس کو بھی انٹرنیشنل لاء کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 1856ء تک معینہ قاعدوں پر یورپ میں صرف عیسائی سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے ضمن میں عمل کیا جاتا رہا' غیر عیسائی سلطنتوں کے لئے ان معینہ قواعد پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ 1856ء میں پہلی مرتبہ مجبوراً یورپی عیسائی سلطنتوں نے اعتراف کیا کہ اس قاعدے کا اطلاق ایک غیر عیسائی سلطنت یعنی ترکی کے ساتھ بھی ہو گا۔ اس کے بعد تقریباً ساٹھ ستر سال کا پھر وقفہ پڑا اور دوسری سلطنت جس کو یورپین کمیٹی نے انٹرنیشنل لاء کے قواعد کا اہل سمجھا وہ جاپان تھا' جب اس نے 1905ء کی جنگ میں روس کو شکست دی۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ اور سلطنتوں کو بھی اس کا اہل سمجھا گیا اس سلسلے میں کچھ شرطیں رکھی گئیں' جن کو پورا کرنے کے بعد کسی سلطنت کو لیگ آف نیشنز کا رکن بنایا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جمعیۃ اقوام یعنی League.of.Nations کی بجائے (مجلس) اقوام متحدہ یعنی United.Nations.(Organisation).(UN) کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں بھی ہر ملک کو اپنی ذاتی حیثیت سے رکن نہیں بنایا جاتا جب تک کہ کم سے کم دو ایسی سلطنتیں جو پہلے اقوام متحدہ کی رکن ہوں' سفارش نہ کریں اور یہ اطمینان نہ دلائیں کہ یہ واقعی متمدن سلطنتیں ہیں' انٹرنیشنل لاء پر عمل کرتی ہیں اور اس کی مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کے مطابق عمل کیا جائے۔

ان حالات میں میں اپنے اس ابتدائی بیان کو دہراتا ہوں کہ اگر انٹرنیشنل لاء چند مخصوص قوموں کے لئے نہیں بلکہ اس کا اطلاق دنیا کے تمام ملکوں پر یکساں ہونا چاہیے تو اس قانون کا آغاز مسلمانوں سے ہوا اور شاید اب بھی مسلمانوں ہی کے ہاں وہ قانون ہے۔ کسی دوسرے کے پاس تاحال نہیں آیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس وقت مجلس اقوام متحدہ کا رکن بننا ہر

سلطنت کے لئے ممکن نہیں ہے جب تک دو رکن سلطنتیں اس کی سفارش نہ کریں اور اس کی ذمہ داری نہ لیں کہ یہ واقعی ایک متمدن سلطنت ہے۔ اس کے بر عکس اسلامی قانون میں اس فرق و امتیاز کی گنجائش نہیں کہ کوئی ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد پر عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ حتی کہ ہم دیکھیں گے کہ اگر کوئی دشمن ہمارے ساتھ غیر انسانی برتاؤ بھی کرتے' تب بھی ہم اس کے ساتھ اپنے قواعد کے مطابق انسانیت کا برتاؤ کریں گے۔ ان حالات میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ قانون بین الممالک جو حقیقت میں بین الممالک بھی ہو اور قانون بھی ہو' مسلمانوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا آغاز کس طرح ہوا؟ اور چیزوں کی طرح یہ بھی رسول اکرمؐ کی سیرت پر مبنی ہے' کیونکہ جب مکہ معظمہ میں اسلام شروع ہوا تو ابتداء میں بہت سی عملی دشواریاں تھیں کیونکہ مسلمانوں کے پاس کوئی علیحدہ مملکت نہیں تھی۔ وہ شہر مکہ میں رہتے تھے اور ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ مملکت کے اندر ایک مملکت (State.Within State) کی حیثیت رکھتی تھی یعنی مسلمانوں کی آبادی شہر مکہ میں تو تھی' لیکن شہر مکہ کے پرانے نظام کے تحت نہیں تھی۔ پرانے شہر مکہ کا جو حاکم تھا اس کی وہ اطاعت نہیں کرتے تھے اور اپنی ہر ضرورت کے لئے اپنے سردار' رسول اکرمؐ سے رجوع کرتے۔ ان کا اپنا علیحدہ قانون تھا' اپنی علیحدہ تنظیم تھی۔ میں یہ بھی کہتا چلوں کہ اسلام کے آغاز پر شہر مکہ واقعی ایک شہری مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں کچھ آزاد قبیلے تھے جو خانہ بدوش لوگوں پر مشتمل تھے۔ عرب میں کچھ اور شہری بھی تھے۔ ایسے شہروں کے حالات پر اب تک کم کام کیا گیا ہے' البتہ طائف اور مکہ کے متعلق بعض چیزیں تحریر ہوئی ہیں۔ لیکن اور بھی شہر تھے۔ مثلاً شہر مدینہ کے حالات پر قانونی نقطہ نظر سے میری نظر سے آج تک کوئی چیز نہیں گزری۔ اس کے متعلق بہت کم ایسی چیزیں ملتی ہیں جن کا تعلق اسلام سے پہلے کے ادوار سے ہو۔

اسلامی مملکت کا قیام:- شہر مکہ میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کی حیثیت ایک مملکت در مملکت کی تھی' لیکن جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں چند ہی ہفتوں کے اندر مسلمانوں نے ایک مملکت قائم کر دی جس کا دستور بھی ہم تک پہنچا ہے' یہ ایک مثال ہے اس امر کی کہ مملکت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ پرانی سلطنتوں سے متعلق ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ وہاں مملکت کس طرح قائم ہوئی۔ شہر مدینہ کے متعلق ہمیں مبینہ طور پر تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ اس شہر میں کئی قبیلے رہتے ہیں جن میں تقریباً سال سے

آپس میں لڑائی بھڑائی کا سلسلہ جاری ہے اور وہاں کوئی مرکزیت' تنظیم یا حکومت بالکل نہیں پائی جاتی۔ ایسے میں حضورؐ نے تجویز پیش کی کہ دفاعی و عدالتی اغراض کے لئے اہل مدینہ اپنے آپ کو منظم کر لیں اور اپنے لئے سردار منتخب کر لیں۔ آپؐ کی اس تجویز کو مقامی باشندوں اور قبیلوں نے قبول کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو سردار کیوں بنا لیا گیا جب کہ مسلمان وہاں اکثریت میں نہیں تھے۔ وہاں مسلمان بھی دو طرح کے تھے' مدنی مسلمان یعنی انصار اور مکی مسلمان یعنی مہاجر۔ ساتھ ہی مدینے کے مشرک بھی تھے' جنہوں ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھی۔ یہودی بھی تھے اور کچھ عیسائی بھی وہاں پائے جاتے تھے۔ اس تنوع اور باہمی اختلاف کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کو مدینہ کا سردار منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ شہر مدینہ کے قبیلوں میں آپس میں سخت لڑائی جھگڑے تھے' اس لئے یہ عملاً ناممکن تھا کہ ان قبیلوں کے کسی شخص کو سردار منتخب کیا جائے تو دوسرے قبیلوں کے لوگ اسے قبول کریں۔ "ب" کو منتخب کیا جائے تو "الف" قبول نہیں کرتا "الف" کو کیا جائے تو "ج" قبول نہیں کرتا۔ ان حالات میں انہیں مناسب یہ معلوم ہوا کہ کسی اجنبی کو سردار بنا لیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سردار منتخب کر لیا گیا اور سردار اور رعیت کے حقوق و فرائض دونوں تفصیل کے ساتھ ایک دستاویز میں لکھے گئے۔ یہی دستاویز جسے ہم شہری مملکت مدینہ کا دستور کہہ سکتے ہیں۔ وہ دستور جو ہم تک پہنچا ہے اس میں اندرونی انتظامات کے متعلق کافی تفصیل سے احکام دیئے گئے ہیں اور مذہبی آزادی کا بھی اس میں تفصیل سے ذکر ہے۔ دفاع کے انتظامات اور جنگ و صلح کے قوانین بھی اس میں درج ہیں۔ بہر حال جب یہ مملکت قائم ہو گئی تو بہت جلد مسلمانوں کو جنگوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ 2ھ میں میدان بدر میں مکہ والوں کا یعنی شہری مملکت مکہ کا اس شہری مملکت مدینہ کے مسلمانوں سے مقابلہ ہوا۔

انٹرنیشنل لاء میں عموماً دو ہی چیزوں سے بحث ہوتی ہے' حالت جنگ اور حالت امن میں غیروں کے ساتھ تعلقات۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو حالت امن کے صرف چند مہینے ملے اور اس کے بعد یہ جنگ پیش آئی۔ انٹرنیشنل لاء کا دوسرا جز یعنی حالت جنگ کے قوانین کیسے ہیں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ہمیں اس کی نظیریں ملنے لگتی ہیں۔ یعنی اعلان جنگ کیا جائے یہ نہ کیا جائے؟ جنگ میں صرف بالغ مردوں کو قتل کیا جائے جو ہتھیار اٹھا کر حملہ کرتے ہیں یا دشمن کے

ہر فرد کو، بچے کو بھی، بیمار کو بھی، غلام کو بھی قتل کر سکتے ہیں؟ صرف میدان جنگ میں قتل کیا جائے یا میدان جنگ کے باہر بھی اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اگر مثلاً دشمن کے آدمیوں کو ہم جنگ میں گرفتار کرلیں تو ان جنگی قیدیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟ کیا انہیں قتل کر دیا جائے؟ یا انہیں مفت رہا کر دیا جائے؟ یا انہیں فدیہ لے کر رہا کیا جائے یا انہیں تبادلہ اسیران کے طور پر یعنی ہمارا جو قیدی ان کے پاس ہے اس کے معاوضے میں دشمن کا قیدی جو ہمارے پاس ہے رہا کریں وغیرہ؟ اس طرح کی بیسیوں تفصیلیں جو قانون جنگ سے متعلق ہیں ان کے لئے رسول اکرمؐ کا طرز عمل مسلمانوں کے لئے نظیر بنتا گیا، کبھی تو قولی حدیث کے ذریعے سے اور کبھی فعلی حدیث کے ذریعے سے۔ بہر حال دونوں طریقوں سے اسلامی قانون بنتا گیا اور انٹرنیشنل لاء کا اسلامی تصور وجود میں آیا۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا کہ غیر مسلم اجنبی کس مذہب کا ہے۔ یہودی ہے، بت پرست ہے، لا مذہب ہے، اس کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا تھا۔ سب کے ساتھ معینہ قواعد برتے جاتے تھے۔ مثلاً اعلان جنگ کی ضرورت ہے تو یہ اعلان جنگ اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا جس کا کوئی مذہب ہے۔ اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو بت پرست ہے، اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو کسی چیز کی قائل نہیں ہے وغیرہ۔

غرض اس طرح رسول اکرمؐ کی دس سالہ مدنی زندگی اسلامی انٹرنیشنل لاء کے اکثر قواعد کو معین و مدون کرنے کا باعث بنی۔ چنانچہ جب اس موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو مسلمان مصنف حسب معمول کچھ قرآن کی طرف دیکھتے، قرآنی آیات کا ذکر کرتے، ورنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل کو بحث میں لاتے کہ فلاں موقع پر حضور اکرمؐ نے یوں کہا تھا، لہٰذا وہ اسلامی قانون ہے۔ یہ اسلامی انٹرنیشنل لاء حضور اکرمؐ کی مدنی زندگی کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ مکی زندگی کی طرف ہم ہی رجوع کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ مملکت در مملکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں جنگ بھی نہیں ہوئی۔ چاہے مسلمانوں کو اذیت دہی کے سلسلے میں قتل کیا جاتا رہا، لیکن جنگ نہیں ہوتی تھی۔

تدوین فقہ:- اس کے بعد مسلمانوں میں فقہ کی ترقی ہوئی۔ جب مسلمان علماء فقہ پر کتابیں لکھنے لگے تو ان کا تصور مغربی تصور کے مقابلے میں بہت وسیع رہا۔ کسی بھی مغربی قانونی کتاب کو آپ اٹھا کر دیکھیں، ان میں عبادات کا ذکر نہیں ہوتا۔ مسلمانوں نے اپنے قانون کو زیادہ جامع بنانے کے

لئے پہلے ہی دن سے اس کو دین و دنیا دونوں کا حامل بنایا اور اس میں صلوۃ' روزہ' حج' زکوٰۃ جیسی عبادتوں کا بھی ذکر کیا' تجارتی معاملات اور وراثت کا شکر بھی کیا اور اس میں انٹرنیشنل لاء کا ذکر کیا' ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان فقہاء کا تصور یہ رہا کہ انٹرنیشنل لاء کوئی انٹرنیشنل چیز نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی چیز ہے۔ ہماری چیز اس معنی میں کہ اجنبی ممالک سے' حالت امن یا حالت جنگ جس قاعدے پر ہم عمل کریں' وہی ہمارا انٹرنیشنل لاء ہے۔ یہ نہیں کہ اس کو اوروں کے مشورے اور رضامندی سے مدون کیا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے بلکہ ان کے نزدیک اسلامی انٹرنیشنل لاء' اسلامی انٹرنیشنل لاء کا ایک جزو تھا۔ اسی لئے جب مسلمان فقہا مجموعہ قوانین مدون کرنے لگے تو انہوں نے اس میں عبادات' معاملات' زواج اور وراثت وغیرہ کے ساتھ ساتھ انٹرنیشنل لاء کا ذکر بھی ضروری سمجھا۔ اس کو بظاہر انہوں نے "سیر" کا نام دیا۔ میں بظاہر کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ اس وقت ہمارے پاس جو قدیم ترین فقہ کی کتاب ہے' وہ امام زید بن علی رضی اللہ عنہ کی کتاب "المجموع فی الفقہ" ہے۔ امام زید رضی اللہ عنہ زیدیہ فرقہ کے بانی اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں۔ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے بیٹے' زید بن علی رضی اللہ عنہ بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے "المجموع فی الفقہ" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں ایک باب انٹرنیشنل لاء سے متعلق ہے جس کو "کتاب السیر" کا نام دیا گیا ہے۔ "سیر" جمع ہے لفظ "سیرت" کی۔ مشہور حنفی امام سرخسی امام نے اپنی "کتاب المبسوط" میں لکھا ہے کہ سیرت سے مراد حکمران کا وہ طرز عمل ہوتا ہے جو اجنبیوں سے حالت جنگ اور حالت امن میں ملحوظ رکھا جائے اور اس میں وہ اضافہ کرتے ہیں کہ غیر مملکت کے لوگ ہی نہیں' ہماری مملکت کے اندر کے باشندوں میں سے بھی کم از کم دو کے متعلق اس کا اطلاق ہو گا' ایک تو مرتدوں کے متعلق اور دوسرے باغیوں کے متعلق۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انٹرنیشنل لاء کا اسلامی تصور' اس تصور کے مقابلے میں جو آج کل مغرب میں پایا جاتا ہے' زیادہ وسیع ہے۔ بہر حال امام زید بن علی رضی اللہ عنہ نے پہلی مرتبہ "سیر" کی اصطلاح انٹرنیشنل لاء کے معنی میں استعمال کی اور اس وقت سے لے کر آج تک اس سے اختلاف نہیں کیا گیا تمام مولف حنفی' شافعی' مالکی' شیعی وغیرہ سبھی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایک واحد استثناء اور وہ بھی نامکمل استثناء اس فرقے سے متعلق ہے جسے ہم خوارج کا نام دیتے ہیں۔ اس مذہب کی فقہ کی کتاب میں جو بڑی مشکل سے میں نے حاصل کی' اس کو بجائے "کتاب

السیر" کے "کتاب الدما" یعنی خون کا قانون کہا گیا ہے کیونکہ اس میں جنگ اور خونریزی سے بحث ہوتی ہے۔ میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو تاریخ سے معلوم ہوا کہ جو کتاب میرے پاس ہے وہ ایک ہمعصر مولف کی کتاب ہے جس کا حال ہی میں انتقال ہوا۔ اس نے اپنی کتاب کی معلومات، خصوصا اس "کتاب الدماء" یعنی انٹرنیشنل لاء کے متعلق پانچویں صدی ہجری کے مولف کی کتاب سے اخذ کی ہیں اور وہ پرانا مولف اس کو "سیر الدماء" کا نام دیتا ہے۔ وہی "سیر" کا لفظ جو ہم استعمال کرتے ہیں وہ اس کو "دماء" یعنی خون کے ساتھ ملاتا ہے "سیر الدماء" یعنی خونوں کے متعلق طرز عمل۔ لیکن حالیہ مولفوں نے "سیر" کے لفظ کو بوجھل پایا اور اسے حذف کر کے "کتاب الدماء" نام رکھا۔

الغرض انٹرنیشنل لاء کے متعلق قدیم ترین کتاب جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے امام زید بن علی رضی اللہ عنہ کی ہے، جن کی وفات میں ہوئی۔ ایک معنی میں وہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے استاد سمجھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اموی سلطنت کے خلاف بغاوت کی لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخر کار وہ گرفتار ہوئے اور انہیں 120ھ قتل کر دیا گیا۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی وفات 150ھ میں ہوئی۔ 120ھ اور 150ھ کے مابین انہوں نے ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا نام "کتاب السیر" تھا۔ اس کی تاریخ دلچسپ ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ وہ فقیہ ہیں جنہوں نے فتویٰ دیا کہ اگر ساری تدبیریں اور کوششیں ناکام ہو جائیں تو اسلامی سلطنت کے مسلمان حکمران کے خلاف بھی تلوار لے کر بغاوت کی جا سکتی ہے۔ دوسرے فقہاء اس طرح کا فتویٰ دینے سے جھجکتے تھے، بلکہ ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ فتویٰ دیا تو انہوں نے اس کی تردید کے لئے کتابیں لکھیں۔ بہرحال امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ اس حدیث پر مبنی ہے **من رای منکم منکرا" فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان۔** یعنی اگر بزور قوت بدلنے کے لئے اس کا امکان نہ ہو تو کم از کم زبان سے، یعنی سمجھا بجھا کر، اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کا بھی امکان نہیں ہے تو کم از کم دل ہی میں اس کو برا سمجھے۔ اگر کوئی شخص برائی کو دیکھ کر دل میں بھی اس کو برا نہیں سمجھتا تو وہ اچھا مسلمان نہیں۔ کم از کم دل میں برا سمجھنا یہ اضعف ایمان یا کم تریان ایمان ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا استدلال تھا۔ دوسرے امام جو اس کے خلاف رائے رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ بغاوت نہیں کی جانی چاہیے، ان کا استدلال ایک

دوسری حدیث تھی۔ وہ حدیث یہ تھی کہ اگر حکمران تمہارے ساتھ عدل کرتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو اور اگر تم پر ظلم کرتا ہے تو صبر کرو۔ تو ایک ہی معنی میں دو حدیثیں ملتی ہیں جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے اگرچہ سیاق و سباق جدا جدا ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی یہ نہیں کہتے کہ ہروقت' ہرچھوٹی بات پر حکومت سے بغاوت کرو بلکہ وہ شرط لگاتے ہیں کہ پرامن وسائل کی ساری کوششیں رائیگاں ہو جائیں تو اس وقت جائز ہے کہ حکمران کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں۔

بہرحال جب امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے وہ کتاب لکھی تو فوراً ایک معاصر فقیہہ امام اوزاعی نے اس کی تردید میں ایک رسالہ لکھا۔ بدقسمتی سے اس وقت ہمارے پاس نہ امام ابو حنیفہ کی کتاب موجود ہے اور نہ امام اوزاعی کا رسالہ بجز ان اقتباسات کے جو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی "کتاب الام" میں جمع کیے ہیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ کن چیزوں کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے سے امام اوزاعی نے اختلاف کیا تھا۔ جب امام اوزاعی نے' جو دمشق کے فقیہہ تھے' امام ابو حنیفہ کی' جو کوفہ یعنی عراق کے فقیہہ تھے' کتاب پر ایک رسالہ لکھا تو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ خود اس کا جواب دیں۔ ان کے ایک شاگرد امام ابو یوسف نے اس کا جواب لکھا۔ یہ کتاب بھی ہمارے پاس محفوظ نہیں' لیکن امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی "کتاب الام" میں جو اقتباسات ہیں ان میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ان اقتباسات کی مدد سے ایک کتاب مرتب کی گئی جو حیدر آباد دکن میں "مجلس دائرہ المعارف" کے اہتمام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کتاب سے امام ابو حنیفہ' امام اوزاعی' امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ اور آخر میں خود امام شافعی کے نقطہ نظر اور ان کے اعتراضات و جوابات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح امام شافعی کی مذکورہ تصنیف کی بدولت ان نایاب کتابوں کا ایک بڑا نادر ذخیرہ ہمارے پاس محفوظ ہو گیا ہے اگرچہ وہ کتابیں کامل طور پر ہم تک نہیں پہنچیں۔ اس سلسلے میں ابن حجر نے اپنی کتاب "تاسیس التوالیف" میں جو امام شافعی کی سوانح عمری ہے' ایک جگہ لکھا ہے کہ "سیر" پر سب سے پہلے امام ابو حنیفہ نے ایک کتاب لکھی' جس کا جواب امام اوزاعی نے دیا اور اس کا جواب الجواب امام ابو یوسف نے لکھا' پھر ان پر تبصرہ امام شافعی نے اپنی کتاب الام میں کیا ہے۔ انٹرنیشنل لاء سے متعلق تالیفوں کے آغاز کی یہ سرگزشت تھی۔

دوسری تصانیف :- اگرچہ انٹرنیشنل لاء کا ذکر سب سے پہلے زید بن علی کی "کتاب المجموع"

میں آیا ہے' لیکن اس کتاب کا صرف ایک باب اس موضوع سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے بیان کیا۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب سب سے پہلے ابو حنیفہ نے تصنیف کی اور یقیناً وہ اپنے معمول کے مطابق اپنے شاگردوں کو اس موضوع پر درس بھی دیتے رہے ہوں گے۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے درس کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے خیالات بیان کرتے' پھر اپنے شاگردوں سے بحث بھی کرتے اور پوچھتے کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اس بحث کی وجہ سے مختلف پہلو واضح تر ہو جاتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے لیکچروں کے اقتباسات کی مدد سے ایک وسیع تر اور جامع کتاب لکھی جا سکتی تھی اور غالباً ایسا ہوا ہو گا۔ امام ابو حنیفہ کی کتاب ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ بیس پچیس صفحوں کا رسالہ ہو گا لیکن ان کے شاگردوں میں سے امام محمد شیبانی' امام زفر اور امام ابراہیم الفزاری کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ کم از کم دو کی یعنی امام شیبانی اور امام فرازی کی کتابیں سینکڑوں صفحوں پر مشتمل ہیں۔ میرا خیال ہے' ممکن ہے صحیح نہ ہو' کہ جب امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب کا درس دیتے رہے تو اس درس کے نوٹس کتابی صورت میں مدون ہوئے جو بعد میں شاگردوں کی طرف منسوب ہو گئے ان میں سے امام الفزاری کے کتاب ایک مخطوطے کی صورت میں مراکش میں موجود ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اس کو پڑھنے کی کوشش کی' لیکن چونکہ یہ کوفی خط میں ہے اس لئے بڑی مشکل سے صرف چند صفحے پڑھے اس کے بعد اسے التوا میں ڈال دیا۔ اب تک اس کے فوٹو میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔

امام محمد شیبانی نے جو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں' کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے انہوں نے السیر الصغیر لکھی تو امام اوزاعی نے طنزاً کہا کہ عراق والوں کو اس موضوع پر لکھنے کی جرات کیسے ہوئی جب کہ وہ علم حدیث سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ پھر امام شیبانی نے کتاب السیر الکبیر کے نام سے ایک جامع تر کتاب لکھی اور اس کا ایک ایڈیشن تیار کیا جو اتنا بڑا تھا کہ اسے جب خلیفہ ہارون الرشید کے پاس تحفہ دینے کے لئے لے جایا گیا تو گاڑی میں ڈال کر لے جانا پڑا۔ بہرحال کتاب السیر الکبیر ہمارے پاس اب اپنی ایک شرح کی صورت میں پہنچی ہے۔ اس کو شرح سے الگ کر کے ہم دوبارہ مرتب کر سکتے ہیں لیکن شرح بھی بہت اچھی ہے۔ امام سرخی رحمتہ اللہ علیہ نے جو پانچویں صدی ہجری کے

مشہور حنفی فقیہہ گزرے ہیں' اس کتاب کی شرح لکھی ہے امام سرخی رحمتہ اللہ علیہ کی تالیف "شرح السیر الکبیر" کے بارے میں ایک بڑی عبرت ناک بات آپ سے عرض کرتا چلوں۔ امام سرخی رحمتہ اللہ علیہ ایک بہت ہی ذہین حق گو اور بے باک فقیہہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ان کو قید کر دیا گیا تھا۔ میرے استاد محترم' مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رائے یہ تھی کہ غالباً امام سرخی کو ایک فتویٰ کی بنا پر قید کی سزا دی گئی تھی۔ ان کے زمانے میں جو حکمران تھے' انہوں نے بہت سے ظالمانہ ٹیکس لگا دیئے تھے۔ حکومت کی آمدنی حکمران کی فضول خرچی کے لئے کافی نہیں ہوتی تھی تو روز بروز نئے ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ امام سرخی نے فتویٰ دیا کہ ظالمانہ ٹیکس ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کون سا حکمران ہے جو اس گستاخی کو معاف کر سکتا ہے؟ لیکن وہ بہت بڑے فقیہہ تھے اس لئے یہ جرات نہیں ہوئی کہ انہیں سزائے موت دی جائے بلکہ ان کو ایک اندھے کنوئیں میں قید کر دیا گیا۔ اس قید کے چودہ سال کے دوران میں کسی طرح انہیں حکمران یا جیلر صاحب سے یہ اجازت مل گئی کہ ان کے شاگرد کنوئیں کی منڈیر پر آ کر بیٹھیں اور استاد کے ارشادات کو نوٹ کرتے رہیں۔ جیلر صاحب کی اس علم دوستی کا میں بھی ممنون ہوں' یقیناً آپ بھی ہوں گے۔ اس چودہ سال کے عرصے میں باآواز بلند املا کرنے کے ذریعے سے امام سرخی نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی فہرست دیکھ میں حیرت زدہ ہو جاتا ہوں۔ غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ "کتاب المبسوط" تیس جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ پوری کتاب کنوئیں کے اندر سے املا کرائی گئی۔ شرح السیر الکبیر چار جلدوں کی ضخیم کتاب ہے وہ بھی اس قید خانے سے املا کرائی گئی۔ اس طرح کوئی درجن بھر دوسری کتابوں کی شرحیں ہیں جو اسی قید کے زمانے میں تالیف ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں آزادی نصیب کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس آزادی سے فائدہ اٹھائیں اور اس عالم سے سبق لیں جس نے قید خانے کے اندر' جہاں ایک بھی کتاب ان کے پاس نہیں تھی' اپنا علمی کام جاری رکھا اور علم کی وہ خدمت انجام دی کہ بڑے سے بڑے عالم بھی اس کے عشر عشیر پر فخر کریں۔

مشکلات تالیف:- یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دوں کہ کیا کوئی شخص "کتاب المبسوط" اور "شرح السیر الکبیر" جیسی ضخیم کتابیں بغیر مواد سامنے موجود ہوئے املا کرا سکتا ہے؟ میری گذارش یہ ہے کہ استاد کے پاس کتابیں نہیں تھیں لیکن شاگردوں کے پاس کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ کوئی کتاب لائیں اور پڑھیں' استاد اس کی شرح کرے۔ چنانچہ "کتاب المبسوط" جو تیس جلدوں میں

لکھی گئی ہے وہ اصل میں "کتاب الکافی" کی شرح ہے۔ سات آٹھ سو صفحوں کا اس کا مخطوطہ میں نے استنبول میں دیکھا ہے۔ اسے غالباً شاگرد پڑھتے تھے۔ شاگردوں کی آواز وہ کنوئیں کے اندر سے سن سکتے تھے اور اندر سے جملہ بہ جملہ اس کی شرح کرتے جاتے تھے اور شاگرد نوٹ کرتے جاتے تھے غرض "شرح السیر الکبیر" اس طرح تالیف ہوئی اور میری دانست میں آج دنیا میں اس موضوع کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم امام ابراہیم الفزاری رحمتہ اللہ علیہ کے رسالہ کو کتاب قرار دیں تو وہ ابھی تک چھپی نہیں۔ یہ کتاب تقریباً ستراسی سال پہلے حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی تھی، لیکن بدقسمتی سے اب تک اس کا کوئی نیا ایڈیشن نہیں آیا۔ مصر میں اس کے نئے ایڈیشن کی کوشش شروع ہوئی لیکن آدھے سے بھی کم حصہ اب تک چار جلدوں میں شائع ہوا ہے' باقی حصہ ابھی تک چھپ نہیں سکا۔ اس کتاب کی اہمیت دیکھ کر یونیسکو (UNESCO) نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ کام میرے سپرد ہوا اور میں نے اس کا ترجمہ مکمل بھی کر دیا' لیکن ابھی تک اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ بہرحال اس ترجمہ کے سلسلے میں میرے سامنے حیدر آباد دکن دائرۃ المعارف کا ایڈیشن بھی رہا اور صلاح الدین منجد کا شرح کردہ نیا ایڈیشن بھی میرے سامنے رہا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ناکافی ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے استنبول جانے کا سالہا سال تک موقعہ ملتا رہا اور وہاں میں تین مہینے رہ کر استنبول کے کتب خانوں سے استفادہ کا موقعہ پاتا رہا چنانچہ اس کتاب کے ترجمہ میں جہاں کہیں مجھے کوئی دشواری نظر آئی میں ان مخطوطوں کی طرف رجوع کرتا جو استنبول میں ہیں۔ ایک مخطوط مجھے بیروت میں بھی ملا اور ایک پیرس میں بھی ملا جو سب سے قدیم نسخہ ہے۔ ان مخطوطوں کی مدد سے میں ان مقامات کا جن کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا' صحیح لفظ معلوم کر سکا اور اس طرح یہ ترجمہ مکمل ہوا۔

انٹرنیشنل لاء پر جو کتاب امام محمد شیبانی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھی ہے' بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے ہم عصر لوگوں میں ابراہیم الفزاری نے بھی جو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے' ایک کتاب لکھی۔ یہی نہیں بعض اور ممتاز اور مشہور فقہانے بھی اس موضوع پر کام کیا چنانچہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے بھی کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بدقسمتی سے اب یہ کتاب بھی ناپید ہے۔ ان کی کتاب الموطا میں مشکل سے آدھے صفحے کا ایک باب ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہماری ضرورتوں کے لئے کارآمد نہیں۔ اسی طرح ان کے ایک اور معاصر' مشہور مورخ و

اقدی نے بھی "کتاب السیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بھی اب نایاب ہے لیکن امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی "کتاب الام" میں "سیر الواقدی" کے نام سے ایک بہت طویل اقتباس ہے تقریباً پچاس ساٹھ بڑی تقطیع کے صفحوں کا۔

اس موضوع پر یہی ابتدائی کتابیں ہی آخر میں یعنی ایک خاص زمانے میں کسی خاص ضرورت سے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں' پھر اس کے بعد شاید اس کی ضرورت نہ رہی اور یکایک یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اس علم سے مسلمانوں کی دلچسپی اس معنی میں برقرار رہی کہ فقہ کی جتنی کتابیں ابتداء سے لیکر آج تک لکھی گئیں' چاہے وہ کسی بھی مذہب اور فرقے کی ہوں' حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' شیعی یا فاطمی وغیرہ' ان سارے مولفوں کی کتابوں میں "کتاب السیر" کا باب ضرور ملتا ہے۔ مجھے کچھ مقابلہ کرنے کا موقعہ ملا تاکہ یہ معلوم کروں کہ شیعہ' سنی اور فاطمی وغیرہ مورخوں کے خیالات میں اس موضوع سے متعلق کوئی فرق نہیں ہے یا نہیں؟ حیرت ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ ہم عقائد کی بناء پر ضرور جھگڑیں گے' سنی شیعوں سے' شیعہ سنیوں سے' لیکن ان کی فقہ میں کوئی ایسا امتیاز نظر نہیں آتا کہ یہ شیعہ قانون ہے' یہ سنی قانون ہے۔ سبھی اپنے آپ کو اولاً قرآن اور ثانیاً "سیرت پر مبنی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں کیا فرق ہو گا۔ تاریخی واقعات میں چاہے ایک کا راوی فلاں اور دوسرے کا راوی فلاں دوسرا صحابی ہو' لیکن جس چیز کا ذکر ہو گا اس چیز میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گذشتہ تیرہ سو سال سے جو فقہ کی کتابیں چاردانگ عالم میں لکھی جاتی رہیں اور مختلف مذہبوں کے مولفوں کے قلم سے نکلی ہیں' ہم ان میں ہر جگہ "کتاب السیر" کو پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو کتاب کتابوں کا اقتباس کہی جاتی ہے' یعنی "فتاوائے عالمگیری" اس میں بھی اس پر ایک باب ہے۔ بہت سی دلچسپ معلومات اس میں ملتی ہیں خصوصاً اس بنا پر کہ بعض ایسی کتابیں جن سے اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے زمانے میں استفادہ ممکن تھا' اب نایاب ہو گئی ہیں اور ان کے اقتباسات اس میں ملتے ہیں۔ ان کتابوں کا جو سلسلہ شروع جاری رہا وہ ایک معنی میں شرح اور تمثیل ہو سکتا تھا۔ یعنی اصولوں کی حد تک کوئی فرق نہیں ہوتا' مثالیں زیادہ دی جاتی ہیں' تفسیریں زیادہ کی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مجھے ایسا نظر آیا کہ بعض ممالک کی خصوصیات کی وجہ سے بعض چیزوں کا ذکر کرتے ہیں' جن کو بعض دیگر ممالک کے لوگ بیان نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر امام سرخسی اپنی کتاب میں جنگ کے دوران میں بیلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگ بیلوں پر بیٹھ

کر دشمن سے جنگ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی ملک میں ہو گا جہاں ہیل ہوتے ہیں ورنہ اور ملکوں میں مثلاً عرب میں ہیلوں کا ذکر نہیں آئے گا۔ اسی طرح مالکی مذہب کے مورخ اور مولف جن کا تعلق شمالی افریقہ سے ہے اور ان کے تعلقات سپین وغیرہ سے قریبی رہے اکثر زہریلی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں یعنی تیر میں زہر شامل کیا جاتا تھا تاکہ اگر دشمن زخمی ہو تو اس کا زخم اچھا نہ ہو پائے۔ اس کا ذکر مجھے اور مقاموں کی کتابوں میں نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا رواج دوسرے ملکوں میں نہیں تھا۔ اسی طرح امام سرخی رحمتہ اللہ علیہ کی کتابوں میں سامان کو لانے اور لے جانے کے لئے گاڑیوں کا ذکر آتا ہے۔ دوسرے مولفوں کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً ان کے زمانے میں جانوروں پر سامان لاد دیا جاتا تھا۔ گاڑیوں کے اندر سامان رکھ کر اس کو جانور کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا رواج ان ملکوں میں نہیں تھا غرض بہت سی مخصوص معاشرتی مثالیں ہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں۔

کتابوں کے متضمنات:- انٹرنیشنل لاء کی تاریخ کے سلسلے میں ان تفصیلات کے بعد مختصراً اس بات کا ذکر ہے کہ انٹرنیشنل لاء میں کیا چیزیں بیان ہوتی ہیں۔ آج کل ہمارے زمانے میں Public International Law اور Private International Law دو مختلف فن اور مختلف علم سمجھے جاتے ہیں لیکن ہمارے فقہاء کی کتابوں میں یہ امتیاز نہیں ملتا۔ ایک ہی کتاب میں دونوں علوم کے احکام بیان کرتے ہیں۔ کچھ مثالیں دے کر واضح کروں گا کہ ان دونوں علوم میں کیا فرق ہے Private International Law میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری سلطنت کی رعیت سے ہوتے ہیں اس کے برخلاف Public International Law میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت سے ہوتے ہیں' اس کی رعیت سے براہ راست تعلقات نہیں ہوتے۔ یہ بنیادی فرق چند مثالوں سے سمجھ میں آجائے گا۔ شہریت (Nationality) کے قانون کو لیجئے کہ ایک شخص کو کس شہریت کا حامل سمجھا جائے گا یا وہ اپنی شہریت کو بدل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر بدل سکتا ہے تو کن احکام و قواعد کے ذریعے سے؟ اس کا ذکر پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں آئے گا' پبلک انٹرنیشنل لاء میں اس کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس طرح اور بھی چیزیں ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان مولفوں کے تصور کے مطابق اس پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں مسلمانوں کے اندرونی تعلقات کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ مثلاً شیعہ اور سنی فرقوں کے تعلقات پر قانونی نقطہ نظر سے بحث ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک

حاکم عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ مرنے والا مزہبا" شیعہ ہے اور اس کی بیوی جو وارث بنی ہے وہ سنی ہے۔ کس قانون کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے؟ اس مسئلے کا تعلق مسلمانوں کے پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء سے ہو گا۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک مسلمان فرد رعیت نے کسی اجنبی ملک کے فرد رعیت سے کاروبار اور تجارت وغیرہ کے سلسلے میں معاہدہ کیا۔ اجنبی ملک کا قانون حکم دیتا ہے کہ جو شخص سرکاری طور پر بالغ نہ ہو یعنی اس کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو تو اسے معاہدہ کرنے کا حق نہیں' اس کا کیا ہوا معاہدہ لغو سمجھا جائے گا۔ اسلامی قانون میں عمر کا تعین نہیں ہے بلکہ جسمانی بلوغ دیکھا جاتا ہے جو ممکن ہے اٹھارہ سال سے کم عمر میں ہو جائے۔ ایک مرتبہ کسی جھگڑے کی وجہ سے مقدمہ عدالت کے سامنے آتا ہے اور وکیل صاحب کہتے ہیں کہ میرے موکل نے جب معاہدہ کیا تھا' وہ نابالغ تھا' Period اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی' لہٰذا معاہدہ کالعدم قرار دیا جائے۔ اس قسم کے جو مسائل ہوتے ہیں' ان کا تعلق پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء سے ہوتا ہے اور اس کے قواعد مقرر ہیں کہ مدعاعلیہ کے قانون کے مطابق عمل کیا جائے گا' مدعی کے قانون کے لحاظ سے نہیں کیا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برخلاف پبلک انٹرنیشنل لاء میں تین چیزوں' قانون امن' قانون جنگ اور قانون غیر جانبداری سے بحث ہوتی ہے۔ قانون غیر جانبداری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں ہماری حکومت مثلاً غیر جانبدار ہے تو اس کے تعلقات فریقین جنگ کے ساتھ کس طرح ہوں گے یا فریقین جنگ میں کسی ایک یا دوسرے کے تعلقات ان ملکوں سے جو جنگ میں شریک نہیں ہیں' کس طرح کے ہوں گے؟ اس کی کچھ تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ قانون امن میں زیادہ تر تین چار چیزوں سے بحث ہوتی ہے۔ Sovereignty یعنی حاکمیت سے' کہ کس مملکت کو خود مختار سمجھا جائے۔ انٹرنیشنل لاء کی جدید کتابوں میں' واقعتہ" خود مختار سلطنتوں کے علاوہ باغیوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے' مگر اس وقت جب ان کی بغاوت ترقی کر کے ایک حد تک مستحکم ہو جائے اور وہ کسی علاقہ پر خود مختارانہ طور پر حکمرانی کرنے لگیں۔ اسی طرح اس میں Sovereignty کی تفصیلات ہوتی ہیں کہ کن کن چیزوں میں Sovereignty کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ برٹش انڈیا میں انگریزی دور میں ایک علاقہ تھا جس پر انگریز براہ راست حکومت کرتے تھے۔ لیکن کچھ ریاستیں بھی تھیں جیسے بہاول پور' حیدر آباد اور کشمیر وغیرہ۔ آیا ان ریاستوں کو انٹرنیشنل لاء کی اغراض کے لئے مملکت تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر کیا جائے گا تو اس

کے کیا قواعد ہوں گے؟ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ریاست سو فی صد خود مختار نہ ہو لیکن اسے ایک حد تک خود مختاری حاصل ہو مثلاً اسے اس کی اجازت ہو کہ اپنا ایک سفیر رکھے' چاہے ساری دنیا کی مملکتوں میں نہیں' صرف ایک ہی سلطنت میں' تو بھی ہم اسے انٹرنیشنل لاء کا موضوع قرار دیں گے۔ غرض اس طرح کی تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ ایک دوسرا باب جائیداد (property) کے متعلق ہے جس میں زیادہ تر فتوحات سے بحث ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسری سلطنت کا کچھ علاقہ فتح کر لیں تو کیا وہ خود بخود ہماری سلطنت کا جزو بن جاتا ہے یا اس کے لئے کوئی رسمی کاروائی درکار ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہوتی ہے؟ اس طرح جائیداد کے فروخت کرنے کے متعلق بھی اس میں بعض دلچسپ چیزیں ملتی ہیں یعنی کبھی تو فتح کے ذریعہ سے کسی علاقہ پر قبضہ ہوتا ہے' کبھی تبادلہ علاقہ کے ذریعہ سے ایک علاقہ دوسری سلطنت کو دیا جاتا ہے یا کبھی تحفہ کے طور پر۔ اس کی بہت سی مثالیں اسلامی تاریخ ہند میں ملتی ہیں۔ دو حکمرانوں میں ایک علاقہ کے متعلق جھگڑا ہوتا ہے' بالآخر اس بات پر مصالحت ہو جاتی ہے کہ میری بیٹی کا نکاح تمہارے بیٹے سے ہو جائے تو میں جہیز میں وہ علاقہ تمہیں دے دوں گا' ہار مان کر نہیں دوں گا' وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں تاریخ میں پیش آتی رہی ہیں۔ جائیداد کے متعلق جو قواعد ہیں ان کا بھی اس میں ذکر کیا جاتا ہے۔

دائرہ اختیار:- اس میں ایک اور چیز کا ذکر آتا ہے۔ Jurisdiction یعنی دائرہ اختیار کے متعلق کہ ایک ملک کے قواعد دوسرے ملک کی رعیت پر چلیں گے یا نہیں' اور چلیں گے تو کس حد تک چلیں گے اور کون سا قانون نافذ ہو گا؟ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز آپ کے سامنے عرض کروں۔ امام محمد شیبانی رحمتہ اللہ علیہ کی "السیر الکبیر" میں ایک باب بہت دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر غیر ملک کے لوگ ہمارے ملک میں آئیں اور ہماری عدالت سے رجوع کریں تو ہمارا قاضی ان پر انہی کا قانون نافذ کرے گا۔ فرض کیجئے وہ ہندوستان آئے۔ ان میں آپس میں جھگڑا ہوا اور وہ ہماری عدالت سے رجوع کرتے ہیں تو ہندوؤں یا ہندوستان کا قانون ان پر نافذ ہو گا' پاکستانی قانون کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء اور قاضیوں کو غیر ملکیوں کے قانون سے واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ غالباً عہد نبویؐ کی بعض مثالوں سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں چند یہودی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نوجوان جوڑے کو پکڑ کر کہا کہ انہوں نے

آپس میں زنا کیا' تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ توریت میں زنا کا کیا حکم ہے؟ شروع میں انہوں نے کہا کہ ان کے منہ پر کالک لگائی جائے اور انہیں گدھے پر اس طرح سوار کرایا جاوے کہ گدھے کے منہ کی طرف ان کی پیٹھ ہو اور گدھے کی دم کی طرف ان کا منہ ہو اور انہیں سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے گھمایا جائے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا' نہیں تم جھوٹ کہتے ہو۔ پھر کہا کہ توریت کا نسخہ لاؤ اور جب توریت کا نسخہ لایا گیا تو ایک نومسلم یہودی' حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا کہ اس کی (یعنی عبداللہ بن سلام کی) موجودگی میں پڑھو۔ یہودی نے پڑھنا شروع کیا۔ ایک مقام پر انگلی رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ عبداللہ بن سلام نے کہا یہ انگلی اٹھا کر نیچے کی عبارت پڑھو۔ وہاں لکھا تھا کہ زنا کی سزا رجم ہو گی۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجم کرایا۔ یہ نظیر بتاتی ہے کہ اجنبیوں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا' بلکہ انہی کا قانون نافذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کئی صفحوں کی طویل بحث میں بتایا ہے کہ اجنبیوں پر اجنبیوں کا قانون ہماری عدالت میں کس انداز سے نافذ ہوتا ہے۔

اس طرح انٹرنیشنل لاء قانون امن (Law of Peace) کا تعلق سفارت سے ہے۔ قدیم زمانے میں سفیر مستقل نہیں ہوتے تھے بلکہ معینہ غرض کے لئے معینہ مدت کے لئے بھیجے جاتے تھے اور کام سرانجام دینے کے بعد واپس آ جاتے تھے۔ اس سلسلے میں امیر علی نے of the Saracens History میں لکھا ہے کہ مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے دو سو سال پہلے مسلمانوں میں ہوا۔ یہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔

ISBN - 969 - 503 - 085 - 8

الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب

اردو بازار لاہور